رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴　　بسم اللہ　　جلد ۱۲ شمارہ ۴

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

ملاحظات	ــــــــ	۲	لارڈ رپن کا عہد حکومت	ض - ا - ب، بی اے	۷۰
مثنوی سحر البیان (تنقید)	جناب محمد عبد القادر سروری بی اے	۵	استفسارات	ــــــــ	۷۵
حسرت آرزو (افسانہ)	جناب سید امتیاز احمد بی اے	۱۶	کتب موصولہ	ــــــــ	۸۵
مثنوی اور سودا (تنقید)	جناب تمکین کاظمی	۳۰	منظومات:	غلام ربانی عزیز - قدیر الوی	۹۳
؟ (افسانہ)	جناب حفیظ الرحمن بی اے	۴۴	〃	شہاب برنی	۹۴
علم فراست الید	ــــــــ	۴۹	غزلیات:-	اکبر حیدری - راز رامپوری	۹۵
ملاح کی لڑکی (افسانہ)	جناب اعظم کریوی	۵۴	〃	حافظ غازیپوری - یوسف گجراتی	۹۶
رامائن کے چھ ورق (نظم)	جناب طالب الہ آبادی	۶۱			

آپ کو تمام مشہور مصنفین کی کتابیں خواہ قدیم ہوں یا جدید "نگار بک ایجنسی" فراہم کر سکتی ہے جس کتاب کی ضرورت ہو پہلے ہم سے خط و کتابت کیجئے

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد (۱۲) | اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء | شمار (۴)

ملاحظات

دارالاقبال بھوپال کے جواں بخت اور فرخندہ شیم فرمانروا نے جس فراخدلی کے ساتھ اپنی حکومت کا نظم ونسق، آئین جدید کے ماتحت ایک مجلس مقننہ کے سپرد کیا ہے، وہ تاریخ حکومت میں ہرچند کوئی نئی چیز نہیں، لیکن کم ازکم ریاستوں کے حلقہ میں نادر الوقوع ضرور ہے۔ وہ حضرات جو ریاستوں کے حالات سے باخبر ہیں ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ریاستوں کا نظام حکومت ایک ایسا سخت استبدادی آئین حکومت ہے جو اس عہد اشتراکیت میں بھی دور فراعنہ کی یاد کو تر و تازہ رکھے ہوئے ہے اور یہ بھی ایک نفسیاتی صداقت (Psychological truth) ہے کہ تفوق شخصی کی لذت ایسی معمولی لذت نہیں ہے جس کو ایک شخص آسانی کے ساتھ ترک کر دے اس لئے اگر بھوپال کے جدید فرمانروا کی طرف سے جبکہ عنان حکومت ہات میں لئے ہوئے انھیں ایک سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا اور اس حالت میں کہ عمر کے لحاظ سے انھیں سلطنۃ ذاتی اور حکومت شخصی ہی کو پسند کرنا چاہئے دفعتہً اس روشن خیالی کا ثبوت بہم پہونچتا ہے، تو ہم سوائے اس کے کوئی تاویل نہیں کرسکتے کہ یہ نتیجہ ہے صرف اس تربیت صحیحہ کا جو ان کو اپنی مادر محترم سابق فرمانروائے بھوپال علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم بالقابہا (طول اللہ عمرہا) کی آغوش میں حاصل ہوئی۔ جن لوگوں نے عہد سلطانی میں زندگی بسر کی ہے اور اسی کے ساتھ نظم حمید اللہ خانی کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اس انقلاب کا تخم اب سے بہت پہلے بویا جاچکا تھا اور اس "سال نکو" کی بہار اس سے قبل ہی پہچان لی گئی تھی۔ اس لئے ہمارے لئے

ہر قسم کا عطر کارخانہ صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

یہ اعلان کوئی جدید چیز پیش نہیں کرتا، بلکہ انھیں اُمیدوں کی تکمیل ہے جنھیں خود انھیں محترم و متبرک ہستیوں نے ہمارے اندر پیدا کر دیا تھا۔

ہز ہائنس سکندر صولت بالقابہٗ (کثر اللہ امثالہ و ادامہ اللہ بالعزو الاجلال) نے افتتاح مجلس کے وقت جو پیام اپنے ملک کے باشندوں کو دیا ہے وہ ایسی دانشمندانہ محبت سے لبریز ہے کہ اس پر وثوق کر کے ہم بھوپال کے لئے ایک نہایت ہی روشن عہد کی توقع قائم کر سکتے ہیں اور عالی جناب علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم بالقابہا نے جن الفاظ میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے وہ ایک قوم کے لئے بجا طور پر قابل فخر و ناز ہو سکتے ہیں۔

علیا حضرت اپنے عہد حکومت میں بھی ہمیشہ ایک رحمدل خاتون ہی رہیں اور فرمانروا کی حیثیت سے کبھی اپنے آپ کو پیش نہیں کیا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے جانشین فرزند نے بھی تخت حکومت پر متمکن ہوتے ہی زیادہ مستحکم و موثق انداز سے اس خلوص و محبت کو ظاہر کر دیا جو ایک نیک نفس روشن خیال، تعلیم یافتہ اور مہذب فرمانروا کو قدرتاً اپنی رعایا کے ساتھ ہونی چاہئے۔

ناظرین نگار کے لئے یہ خبر نئی نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے قبل ملک کے اخبارات میں اس کا ذکر دیکھ چکے ہیں، لیکن چونکہ میری ادبی و علمی زندگی اور نگار کی حیات اسی آستان نکتہ نواز اور اسی بارگاہ علم پرور سے وابستہ ہے اس لئے میرے لئے ناگزیر تھا کہ میں اس جدید انقلاب کے بعد سب سے پہلی اشاعت کا سرنامہ اسی خبر کو قرار دوں جو نہ صرف میرے بلکہ تمام وابستگان دامن دولت کے لئے ایک دنیائے مسرت اپنے ساتھ لائی ہے۔

تا گل و سبزہ و ریحاں ز خیاباں جویند ——— تا کف و موجہ و گرداب بدریا بینند
تا بریں پشتہ نشاں از مہ و پرویں یابند ——— تا دریں رہ اثر از آدم و حوا بینند
تا ہر سال شمار دے و بہمن ورزند ——— تا ہر ماہ طراز دی و فردا بینند

ہم بدیں ساز ہنگامۂ ہر عید سعید
شاہ جم کوکبہ را انجمن آرا بینند

لکھنؤ کا موسم ابھی تک ناخوشگوار ہے گرمی ہر چند مذبوحی حالت میں ہے لیکن رقص بسمل کی طرح ناپائیدار نہیں آفتاب کا طلوع و غروب ابھی تک خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی طرف نہیں ڈھلا اس لئے زمانہ بدستور عرقناک ہے۔ سنتے ہیں کہ ۱۵ اکتوبر کے بعد سے یہاں نمایاں تغیر پیدا ہو جائیگا۔ لیکن القاء عہد کے خیال کے ساتھ جینے کی تمنا بالکل غیر شاعرانہ بات ہے، اس لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ عالم نامرادی ہی میں زندہ رہنا سیکھ جاؤں۔

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر خرید کرنا چاہئے

اس اشاعت میں جناب عبد القادر سروری بی اے کا تنقیدی مضمون مثنوی سحر البیان پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا تنقیدی مضمون جناب تمکین کاظمی کا ہے جس میں سودا کی مثنوی نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ فسانوں میں ہمارے عزیز دوست سید امتیاز احمد بی اے کا فسانہ حشر آرزو ایک ایسی استعداد کا پتہ دیتا ہے جس کو مستقبل میں ہمارے اردو لٹریچر کے فن افسانہ نگاری میں بیش بہا اضافہ ثابت ہونا چاہیے۔ بلند فسانہ نگاری کی روح نفسیاتی تحلیل ہے اور اس کے بہت سے کامیاب ٹکڑے اس فسانہ میں پائے جاتے ہیں جناب اعظم کریوی کا افسانہ "ملاح کی لڑکی" جو غالباً بنگالی زبان سے لیا گیا ہے اس قدر مکمل فسانہ ہے جو داد سے مستغنی ہے۔ حفیظ الرحمن صاحب کے افسانہ کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے گو نیا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میاں عطاء الرحمن صاحب کا ایک افسانہ اسی قسم کے پلاٹ کا اب سے کئی سال قبل ہمایوں میں شائع ہو چکا ہے۔

جناب طالب الہ آبادی نے رامائن کے بعض مناظر کو اردو نظم میں پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کوشش مستحسن نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اس مرتبہ استفسار نے بھی کافی جگہ لیلی اور کتب موصولہ کے لئے بھی زاید صفحات دینے پڑے کیونکہ بہت عرصہ سے تبصرہ کو ملتوی کرتا چلا آرہا تھا اس لئے معلومات کا حصہ نہ دے سکا۔

خیال تھا کہ اس مہینے سے ایک مستقل باب "نگار کی ڈاک" قائم کرکے بعض دلچسپ خطوط کا اقتباس اور ان کا جواب درج کروں لیکن اس کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی

منظومات میں غلام ربانی صاحب کی نظم اور غزلیات میں جناب اکبر حیدری کے افکار مخصوص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ جناب راز رامپوری اور جناب حافظ غازیپوری کے بھی بعض بعض شعر خوب ہیں۔

کلام مومن پر اس وقت تک کوئی قابل ذکر تنقید موصول نہیں ہوئی۔ بہر حال دسمبر تک انتظار کرونگا۔ اس کے لئے پچاس روپیہ کا حقیر ہدیہ مخصوص کر دیا گیا ہے

نیاز فتحپوری

سخت ضرورت ہے جولائی ۱۹۲۲ء۔ جنوری ۱۹۲۷ء۔ جولائی ۱۹۲۷ء۔ اگست ۱۹۲۷ء کے نگار کی جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں خط و کتابت کریں۔ منیجر نگار لکھنؤ

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگانا چاہیے

سحر البیان

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۵)

نجم النسا کی جملہ کرداری خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی اس کی قوت گفتار ہے۔ اس کے مکالمے اردو زبان کی بول چال کے چند ایسے دلکش نمونے ہیں کہ اردو ادب ان پر بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ "سحر البیان میں سوائے میر حسن کے فطری بیانات کے اگر کوئی چیز دلچسپ ہو سکتی ہے تو وہ نجم النسا اور بدر منیر کے مکالمے ہیں جن کی وجہ سے تمام قصے کا پایہ بلند ہو گیا ہے۔ اگر قصے میں سے صرف نجم النسا ہی کے مکالمے نکال لئے جائیں تو یہ امر شبہ سے خالی نہیں رہ سکتا کہ "سحر البیان" کو پھر بھی وہی وقعت حاصل رہیگی دراصل "اگر توجہ سے انجام پائے تو مکالمہ ناول کا بہترین عنصر ہوگا"..... عمدہ مکالمہ ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف تربیت یافتہ لوگ حظ اٹھاتے ہیں بلکہ جہلا بھی حسب مقدور لطف اندوز ہو سکتے ہیں[۵]" اس معیار پر ذیل کے مکالمے کس قدر ٹھیک اترتے ہیں۔

(۱) بے نظیر اور بدر منیر کی پہلی ملاقات کے وقت، بدر منیر کو شرماتی اور کھنچتی دیکھکر وہ اپنی زبان کے جوہر دکھاتی ہے۔

مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے

ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں

مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو

....

مے عیش کا جام اب نوش کر
غم دین و دنیا فراموش کر

....

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں

یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
کہاں یہ جوانی، کہاں یہ ابھار

ارے باولی! چاہ میں کر تمیز
کہاں چاہ ڈالے ہیں یوسف عزیز

(۲) ذیل کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

بھلا میری خاطر بلا تو شتاب
تمھیں نے تو چھڑکا تھا مجھپر گلاب

ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش!
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہوش

یہ شعر اس موقع پر نجم النسا کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جب وہ بدر منیر کو شہزادے سے ملنے پر مجبور کر رہی ہے اور بدر منیر خود اسپر بے نظیر سے محبت کرنیکا الزام لگاتی ہے

(۳) نجم النسا کے مجبور کرنے سے، شہزادی بے نظیر کے پہلو میں بیٹھ تو گئی۔ لیکن حیا نے اسکو تکلم سے باز رکھا۔ نجم شہزادی کو سمجھاتی ہے تو یہ نہیں کہتی کہ مہمان کی خاطر زبان کھول، بلکہ:۔

لب لعل شیریں کو ٹک کھول تو
ذرا میری خاطر سے ہنس بول تو

---

[۵] دنیائے افسانہ

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگایئے

(۴) بے نظیر کی فراق کی حالت میں، شہزادی کی سوگواری ملاحظہ ہو۔ بدر منیر کہتی ہے "اے نجم النسا! خدا جانے اس شخص پر کیا ہوا؟" کہ اس کا آنا جانا دفعتاً رک گیا ہے۔ نجم النسا جواب دیتی ہے۔

...... بی تمکو سودا ہے کچھ؟ وہ معشوق ہے اسکو پروا ہی کچھ؟ خدا جانے کس شغل میں لگ گیا مری جڑھ ہے اتنا ہی ہونا خدا

وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ عبث آپ کو مت کرو تم تباہ اس کے بعد وہ شعر آتا ہے جسمیں خاص وعام سب کے لئے یکساں نصیحت موجود ہے

رکے جو کوئی، اس سے رک جایئے جھکے آپ سے وہ تو جھک جایئے

(۵) بے نظیر کی جدائی کی مدت کے ساتھ، اسکا قلق بھی بڑھتا جاتا ہے حتی کہ ننگ وناموس کا خیال بھی محو ہونے لگا

یہ احوال دیکھ اس کا دخت وزیر لگی جل کے کہنے کہ بدر منیر تو وہ ہے کہ سب کے تئیں دے وقوف کدھر دل گیا تیرا اے بیوقوف؟

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کسکے میت اری چار دن کے ہیں یہ آشنا ملا دل کو آخر کرے ہیں جدا!

سو جاتی اپنے پہ جو کوئی مرے تو دل پہلے اپنا بھی صدقے کرے اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو تو پھر چاہیے اس کی پروا نہ ہو

.... تمھاری اسے چاہ ہوتی اگر تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر؟

پانچویں شعر میں "کوئی" کا روزمرہ کے مطابق استعمال، آخری شعر کا استفہامیہ انداز اور ہر ایک کا اسلوب بیان صرف باکمال اہل زبانوں سے ادا ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ ملاحظہ کے قابل نجم النسا کی نصیحت میں عمومیت ہے۔ نصیحت براہ راست ہمیشہ بارگوش ہو جاتی ہے لیکن نجم النسا کی عام طرز ادا نے اسکو سعدی کا "حنظل ..... از دست خوش خو" بنا دیا ہے

(۶) میر حسن کو فطری مناظر کے بیان کرنے میں ید طولی حاصل ہے۔ لیکن "سحر البیان" کا وہ سمان میر حسن کا شہ پارہ ہے جو نجم النسا اور فیروز شاہ کی پہلی ملاقات کے وقت کا کھینچا گیا ہے اسمیں شک نہیں کہ اس منظر کی روح رواں نجم النسا ہی ہے تاہم اس مناظر کی کامیابی کے دو اجزا ہیں۔ ایک تو میر حسن کے خارجی بیانات دوسرے نجم النسا کے افعال اور مکالمے۔ یہاں ہمارا تعلق صرف نجم النسا کے مکالمے سے ہے میر حسن نے جو ماحول "جوگن" کا پیدا کیا ہے اور جو بذات خود دلچسپ ہے، وہ جوگن کی دلچسپ گفتگو کی وجہ سے روشن معلوم ہونے لگتا ہے۔ میر حسن نے چند الفاظ میں خیالات کی ایک کائنات پیدا کر دی ہے خیال کیجئے کہ ایک سہانا دشت ہے جسمیں چودھویں رات کی ہلکی ہلکی چاندنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر عجیب گنگا جمنی سمان پیدا کر رہی ہے۔ شفاف ریت پر ایک مرگ چھالا بچھا ہوا ہے، جس پر اس منظر کو روشن کرنے والی ایک "زہرہ جبین" دوزانو بیٹھی ہوئی ہے۔ بین دست نازک میں ہے اور اپنے میٹھے بولوں سے ہوا میں ایک خوشگوار تموج پیدا کر رہی۔

"وہ سنسان جنگل وہ نور قمر وہ براق سا ہر طرف دشت ودر وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

.... درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور"

ایسی حالت میں فیروز شاہ، جنوں کے بادشاہ کا بیٹا وارد ہوتا ہے۔ جوگن کی تیز نظر اس کی مبہوت آنکھوں کے راستے سے اس کے دل تک جا پہنچی ہے

ہر قسم کے عطریات صغیر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کیجئے

وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر
کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر

کیا اس منظر کی نظر فریبی ایسی نہ تھی کہ فیروز جوگن کی تیرزن کا شکار ہو جاتا؟ وہ دریافت کرتا ہے "جوگی جی" آدیس ہے؟ "بڑا تم پہ ایسا کہو، کیا جوگ لیا واسطے کس کے تجنے یہ جوگ" "کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے" "دیا اپنی ہمیں بھی فرماؤ گے؟"

جوگن اسکی حالت سے واقف ہو چکی ہے۔ اسی لئے اس سرد مہری کے ساتھ جواب دیتی ہے

بہت گرم ہیں آپ اللہ جی کہا تب پری زاد نے واہ جی جہان سے تو آیا چلا جا ادھر کہا ہنسکے جوگن نے ہر بول ہر
فقیروں کو چھیڑو نہ بیٹھے رہو کہا ہوتے سو تو ان سے اپنے کہو ذرا بین سنکر چلا جاؤں گا نہ سوکھی ہوا اتنی بھلا جاؤں گا
وہ کہتا کہا کی نہیں رے نہیں زمیں سے اڑا آسمان کے تئیں اس قیل و قال کے ختم ہوتے ہی فیروز شاہ جوگن کو تخت پر بٹھا لیتا ہے اور۔

(۷) نجم النسا پرستاں میں فیروز شاہ کے باپ جنوں کے بادشاہ کی مہمان ہے۔ تمام لوگ اس کے کمال موسیقی پر حیران ہیں۔ خود فیروز کا باپ ہزار منتوں سے اسکی خوشامد کرتا ہے کہ جوگن اپنے کمال سے مسرور کرے۔ لیکن جوگن کی بیرخی ابتک جاری ہے۔ جوگن کی یہ بیرخی نہایت پر معنی ہے۔ وہ اس حربے سے دو کام لے رہی ہے۔ ایک طرف تو شہزادے بے نظیر کے معاملے میں فیروز سے کام لینے کا خیال اسکے دل میں جاگزین ہے۔ جسکی وجہ سے فیروز کو باور کرانا چاہتی ہے کہ اس کا قابو میں آنا سہل نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے آپ میں اصلی فقیروں کی خصوصیت اور خوبیاں دکھانا چاہتی ہے۔ فیروز کا باپ اس کی بڑی عزت کر کے درخواست کرتا ہے۔

کہا ہم ہیں مشتاق کچھ گائیے سماں بین کا ہم کو دکھلائیے کہا کچھ بجانا نہیں اپنا کام ہر اک طرح لینا ہمیں ہر کا نام

اوپر کے جواب میں لفظی اور معنوی خوبیاں ملاحظہ کے قابل ہیں۔ اپنے مخاطب کو وہ خبردار کر رہی ہے کہ اس کو پیشہ ور گائن نہ تصور کر لیا جائے بلکہ گانا بھی اس کی ایک عبادت ہے:۔

ہے بیزار فرمائشوں سے یہ فقیر
ولے کیا کریں اب ہوئے ہیں فقیر

بادشاہ معذرت کرتا ہے کہ جوگی صاحب آپ ہمارے اسیر کیوں ہونے لگے، اسیر تو ہم ہیں۔ یہ تو آپ کی عنایت ہے کہ آپ چاہیں تو اپنے کمال سے ہم کو خوش کریں ورنہ جسمیں راضی ہو تم سو کریں"

کہا اس طرح سے جو فرماؤ گے
تو ہاں بندگی ہی میں کچھ پاؤ گے

جوگن کے کمال پر بادشاہ مفتون ہو جاتا ہے اور جوگن کی منت کرتا ہے کہ یہ گھر آپ ہی کا ہے اور ہم آپکے غلام ہیں۔

یہ بھی بات سب آپ دوانہ کیساتھ کہاں ہم کہاں تم ہوا یہ جو ساتھ تمہارا مبارک رہے گھر تمہیں کہا اس نے مطلب نہیں کچھ ہمیں

جب فیروز شاہ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کے قریب ہو گیا تو وہ جوگن کے قدموں پر گر پڑتا ہے نجم النسا کو بھی منزل مقصود سامنے نظر آنے لگی تاہم وہ عجب انداز سے فیروز کا حال دل دریافت کرتی ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد میں ہے

گر اتنا تو ہو کے کیوں بے حواس کہ ہے آج کیا یہ خلاف قیاس
تو کہنے لگی مسکرا، اسکو وہ ٹو گر اس طرح سے قدم پر جو وہ ٹو
کہ چھانیوں کی مصیبت ہوئی ٹو مرے بیٹھنے سے اذیت ہوئی ٹو
دیا جی کو تیرے لبھایا کوئی؟ کسی نے ترا دل ستایا کہیں
کہ اب پاؤں پڑ پڑ اٹھاتا ہے تو اذیت مگر ہم سے پاتا ہے تو
چلے ہم، بھلا، جا ترا ہو بھلا فقیروں سے اتنا نہ ہو تو خفا

اس واقعہ میں اتنی ہی ظرافت موجود ہے جتنی مرزا غالب کے اس "ستم ظریف" معشوق میں ہے جو اپنے عاشق کی اس درخواست پر کہ بزم ناز اغیار سے خالی ہونی چاہیے۔ خود عاشق کو بزم سے اُٹھا دیتا ہے۔ صرف اس تغیر کے ساتھ کہ میرحسن کے پاس کا یہ واقعہ غالب کے واقعہ کا عکس ہے۔ غالب کا معشوق اپنے عاشق کو بزم سے اٹھا دیتا ہے اور نجم النسا معشوق ہو کر خود عاشق کی بزم ناز سے اُٹھ جاتی ہے۔

نجم النسا کے کردار کی یہ خصوصیت ان خوبیوں میں سے ایک ہے جو اس کے کردار کو ایک نمایاں انفرادی حیثیت عطا کر رہی ہے۔ میرحسن نے کردار نگاری کے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ اشخاص قصہ میں کسی کو ممتاز اور زندہ کس طرح کرنا چاہیے[۱]۔ فیروز جب حال دل کہہ چکتا ہے۔ تو نجم النسا اس کے جواب میں جو کچھ کہتی ہے اس کا انداز اور طرز ادا کی بیساختگی اور آخری حصے میں احتمال کا اشتمال ملاحظہ ہو۔

تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو مطالب اگر میرے بر لائے تو
جو میری کہانی سنے غور سے لگی ہنس کے کہنے کہ اک طور سے

(۹) کسی کامل فن قصہ نگار کے قصے کے "دو چار صفحوں کے پڑھنے سے بخوبی روشن ہو جائیگا کہ اس کی کردار کشی میں کیا راز پوشیدہ ہے وہ کسی شخص قصہ کا تعارف چند الفاظ میں قاری سے کرا کر، خود خاموش بیٹھ جاتا ہے باقی اپنے واقعات بیان کرنے اور قاری کو مانوس بنا لینے کا کام خود شخص قصہ پر چھوڑ دیتا ہے......... ناول نگار کا مہتم بالشان کمال یہ ہے کہ بیان کے بغیر بھی متکلم کے تیور اور حرکات کو قاری پر واضح کر دے[۲]"

فیروز شاہ بے نظیر کو کنوئیں سے نکال کر لاتا ہے اور جوگن کو اس کے پاس پہونچاتا ہے۔ یہاں پر نجم النسا کا طرز عمل اس کے کردار کی ایک خوبی کی وضاحت کرتا ہے، جسکی طرف میرحسن نے "ستارہ سی" اور "قیامت تحریر" کے الفاظ کے ذریعہ ایک اجمالی اشارہ تعارف کی تقریب میں کر دیا تھا۔ یہ نجم النسا کی ظرافت نہیں بلکہ اس کی "ستم ظریفانہ" سرشت کا ایک منظر ہے۔ اس خاص موقع پر جو اعلیٰ قسم کی ظرافت کا نمونہ اور اردو زبان کا ایک شہ پارہ ہے میرحسن کا قلم ایک لفظ بھی نجم النسا کے طرز عمل کی توضیح کے متعلق نہیں لکھتا۔ بلکہ خود اس کے قول فعل سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ درحقیقت کردار نگاری کا یہ بڑا کمال ہے۔

دکھایا اُسے اور کہا، کر تو غور ٹو .... لے آیا وہ جوگن کو دان ساتھ ساتھ ....
کہا اے پریزاد! تو اٹھ ذرا یہ کہ اور اس تخت کے پاس آ
کہا، ہاں رہی ہاں یہ وہی ہے وہی جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی؟
تو اس بات پر میرے صدقہ نہ ہو کہا اس نے ہنسکر بھلا دیکھ تو
بلائیں میں دل کھو لکر اس کی لوں کہ اس تخت کے گرد اک دم پھروں

[۱] ملاحظہ ہو "دنیائے افسانہ" صفحہ ، سطر ، — ۱۱
[۲] ملاحظہ ہو "دنیائے افسانہ" صفحہ ۸۵-۸۶

کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ چاندنی چوک دہلی میں ہے

کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا　　اے دیو تو کیوں دیوانہ ہوا!

(۱۰) اپنی مہم سے کامیاب واپس ہونے کے بعد نجم النسا بدر منیر شہزادہ کے آنے کی خوشخبری سناتی ہے۔ بدر منیر کو مصداق "عشق است و ہزار بدگمانی" نجم النسا کے کہنے کا یقین نہیں آتا اُسنے ؎

"تعجب سے پوچھا کہ سچ مچ ہے یہ؟　　دیا چھیڑنے کو مرے کچھ ہے یہ؟"

نجم النسا نے جواب میں گفتار کے جو پھول بکھیرے ہیں، وہ اردو روزمرہ اور طرز تکلم کے بہترین نمونے اور ادبیات کا خوشنما زیور ہیں ؎

کہا مجھکو سوگند ہے اس جان کی　　غلط کہنے والی میں قربان کی

پھر فطرت کی ایک حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ

نشاط و خوشی کی خبر یک بیک　　نہیں منہ پہ کہہ بیٹھتے بے دھڑک

"مکالمے کی عمدگی کے جانچنے کا پہلا معیار یہ ہے کہ وہ قصہ میں اس قدر پیوست ہو جائے کہ اس کا جزو معلوم ہونے لگے اور اس سے درحقیقت پلاٹ کے ارتقا یا اشخاص قصہ کے کردار کی توضیح میں مدد ملتی ہو"[۱]

"سحر البیان" کے مکالمے جس خوبی کے ساتھ قصے میں گھل مل گئے ہیں، اس کا ایک عمدہ نمونہ خود کردار زیر بحث ہے اسکی گفتگو کہیں بھی بے موقع اور طویل یا خارج بحث نہیں ہوتی۔ اوپر کی مثالوں کے علاوہ بھی کسی اور مقام سے اس کا امتحان کیا جا سکتا ہے۔ نجم النسا کی قوت گفتار اور خوبی گفتار کے ضمن میں ایک اور اضافہ اس امر کا کر لیا جائے کہ اس کی تقریر کے ضمن میں بعض ضرب الامثال اور حقایق مسلمہ ([illegible]) بھی مترشح ہوتے رہتے ہیں، مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔

"سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

دوسرا معیار مکالمے کی جانچ کا یہ ہے کہ وہ کہاں تک زبان کے اصول اور قواعد اور سب سے زیادہ روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہے۔ میر حسن (اور ان کے اجداد دو اخلاف) کی ٹکسالی زبان اور فصاحت اور بلاغت کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے اس لئے یہاں اور کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اردو زبان اس خاندان کی بڑی منت کش ہے۔ وہ حسن اور انیس کے کلام سے اپنی سند لیتی ہے۔ اگر میر حسن کی زبان پر قدرت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے لئے بدر منیر یا نجم النسا کے مکالمات کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

(۶)

نجم النسا کی کرداری خصوصیت کی طرف ایک اجمالی اشارہ میر حسن نے سب سے پہلے موقع پر اس وقت کیا ہے جبکہ وہ قاری سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔

"تھی ہمراہ ایک اس کے دخت وزیر　　نہایت حسین اور قیامت شریر"

"زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا　　اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا"

حسن کا ہونا تو ہر ایسے شخص میں بے حد ضروری ہے جس سے ایک قصہ نگار اور خصوصاً مشرقی قصہ نگار اپنی مرضی کے مطابق کام لینا اور جس کو قصے میں نمایاں حیثیت عطا کرنا چاہتا ہے یا قاری کی توجہ اسکی طرف وہ منعطف کرانا چاہتا ہے اسی لئے "سحر البیان" جیسے معرکۃ الآرا قصے میں ایک اہم شخص قصہ کا "نہایت حسین ہونا کوئی تعجب خیز یا قابل قدر بات نہیں لیکن اگر نجم النسا کی نوعیت کے کردار میں قیامت کی شرارت اور ستارہ پن نہ ہوتا، تو اس کی

[۱] ملاحظہ ہو دنیائے افسانہ صفحہ ۹

ہر قسم عطر و روغن کارخانہ صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

کامیابی میں ہم کو شبہ ہوسکتا تھا۔

"ستارہ سی" ہونے سے مراد ہم اس کی چلبلی طبیعت لے سکتے ہیں جسکے لئے انگریزی میں بھی ایک موزوں لفظ (humour) ہے نجم النسا کی شرارتوں اور شوخیوں نے جسم قصہ میں زندگی کی لہریں پیدا کردی ہیں اور یہ قصے کے وہی مقامات ہیں جو زیادہ نمایاں اور ہیجان انگیز ہیں افسانہ گوئی اور فسانہ نگاری کی پیدائش کی تاریخی وجہ انسان کا حیرت انگیز واقعات میں دلچسپی لینا ہے۔ اور فلسفیانہ وجہ مسرت طلبی۔ قصے میں نشاط انگیزی اسوقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اسمیں کچھ شوخی اور شرارت موجود نہ ہو۔ اسی لئے "سحر البیان" میں بھی ایک کردار کو شوخی اور شرارت کی کمند قاری کی توجہ کو شکار کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے۔ یہی چیز ہے جو نجم النسا کے کردار کو "سحر البیان" کے دوسرے اشخاص سے زیادہ دلچسپ بنارہی ہے۔ ذیل کی مثالوں سے نجم النسا کی اس کرداری خوبی کی وضاحت ہوسکیگی۔

(۱) بدر منیر کے شہزادہ کو مبہوت چھوڑ کر مکان میں چھپ جانے پر نجم النسا کا شرارت آمیز غصہ ملاحظہ فرمائیے

مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے مری طرف ٹک دیکھ تو ہائی ہائی
ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں۔

(۲) نجم النسا، شہزادی کو بے نظیر سے ملاقات کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ شہزادی بے نظیر کی چاہ کا الزام اسی کی سر پر رکھنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ میں سمجھی کہ تیرا دل ادھر گیا ہے۔ تو مجھپر دھر کر بہانے کیوں کرتی ہے؟ نجم النسا دندان شکن جواب دیتی ہے۔

بھلا میری خاطر بلاؤ شتاب! لگیں نے تو چھیڑا کا تھا مجھپر گلاب
ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش! لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہوش

(۳) شرارت اور ظرافت بسا اوقات ایک ہی گہوارے میں پرورش پاتے ہیں۔ اس کا مطالعہ ذیل کی مثال سے کیجئے۔

پیالے کو بھر جلد اس نے بھرا گلابی کو لا اس کے آگے دھرا
ہوئی دل میں اپنے وہ نجم النسا انھوں کے رکے بیٹھنے سے خفا
لب لعل شیریں کو ٹک کھول تو ذرا میری خاطر سے ہنس بول تو
یہ پیالہ تو اس بت کے منہ سے لگا کہا شاہزادی کو بیٹھی ہے کیا؟

کسی شخص سے یہ کہنا کہ "میری خاطر سے فلاں کام کرو" ایک عام بات ہے۔ لیکن جس موقع پر نجم النسا نے یہ کہا ہے اس کے بیحد شوخ ہونے کی دلیل ہے۔ شہزادہ کے پہلو میں بدر منیر بیٹھی ہے لیکن شرم مانع تکلم ہے۔ اور خاموشی دیکھنے والوں پر شاق گزر رہی ہے۔

(۴) نجم النسا کا تعلق فیروز شاہ کے ساتھ شروع سے آخر تک معشوقانہ شوخیوں کا ایک مجموعہ ہے جتنے اوپر کہیں نجم النسا کی "ستم ظریفی" کی طرف اشارہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسکی شوخیاں عموماً ستم ظریفی کے پیرایہ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ فیروز شاہ کے شہزادہ کو لانے اور نجم النسا کی شرارت کا اوپر ذکر آچکا ہے گرگم گشتہ کے دوبارہ ملنے پر وہ اس کے صدقہ ہونا چاہتی ہے۔ موقع کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کام ایک بیساختہ انداز میں پورا ہونا چاہئے تھا لیکن نجم النسا کی شوخ طبیعت نے اس کام کو بھی دلچسپی پیدا کئے بغیر ختم ہونے نہ دیا۔ چنانچہ وہ تخت سے فیروز کو اتارنا چاہتی ہے۔ صرف اس لئے کہ کہیں وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑجائے کہ نجم میری خدمات کیوجہ سے میرے صدقے ہو رہی ہے اس موقع سے مکمل ظریفانہ سماں اسوقت تک پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ جب تک کہ فیروز شاہ بھی اسی سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ بے زبان فیروز شاہ نے اول اور آخر مرتبہ زبان کھولی اور نجم کی

اعلیٰ درجے کا عطر صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہمیشہ عطر منگانا چاہئے

لیکن نجم نے بھی اچھی طرح خبر لی اور تو اس بات پر میرے صدقے ہو کہا اس نے ہنس کر بھلا دیکھ تو شرارتوں کا انتقام لینا چاہا۔
"سنگ آمد و سخت آمد" غریب فیروز اَرے تو تو کیوں دیوانہ ہوا؟ کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا اس کے دانت خوب کھٹے کیے۔
مجبوراً تخت کو اپنے وجود سے خالی کر دیتا ہے۔

(۷)

شوخی اور شرارت کے صفات سے متصف ہونے کے علاوہ، نجم النسا ذہانت اور عقل کے زیور سے بھی آراستہ ہے۔ شوخ اور چلبلی طبیعت سے وہ شخص کما حقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ذہین بھی ہو اور جسکی عقل ہر واقعہ سے ایک ظریفانہ حالت پیدا کرنے کے رازوں سے واقف ہو۔ نجم النسا کے متعلق یہ امر نہایت اطمینان کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی غیر معمولی ذہانت، حکمت عملی اور عقلمندی کا کافی ثبوت دیا ہے۔

(۱) سب سے پہلا موقع جہاں ہمکو نجم النسا کی عقلمندی کے امتحان کا اتفاق ہوتا ہے وہ بدر منیر اور بے نظیر کی پہلی ملاقات ہے جسمیں بدر منیر کی شرم کا اضطراری جذبہ اسکی شہزادے سے ملنے کی تمنا پر غالب آ جاتا ہے اور وہ پردے کے اندر چھپ جاتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ نجم النسا سے کم عقل کا آدمی بھی بدر منیر کی چاہ کا قیاس کر سکتا ہے۔ لیکن نجم النسا اپنے قیاس پر جس طرح عمل پیرا ہوتی ہے وہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ شہزادی کو نہ صرف صاف کہدیتی ہے کہ تجھکو اپنے عاشق کو نیم بسمل چھوڑ کر اس طرح سے خاموش نہ بیٹھ جانا چاہئے بلکہ ایک نہایت طول طویل تقریر میں اسکو منزل عشق کی راہ و رسم بھی سکھاتی ہے۔ نجم النسا کی اس طولانی تقریر کو ہم یہاں نقل کرنا اس لئے بے ضرورت سمجھتے ہیں کہ پہلے انھیں اشعار کا اسکی قوت تکلم کے ضمن میں اندراج ہو چکا ہے تاہم یہاں اس امر کا اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نجم النسا کی محولہ تقریر میں بعض ایسے خیالات کا بھی اظہار ہو گیا ہے، جو "کائناتی صداقت" (Universal truth) سے پر ہیں۔ مثلاً

وے حاصل عمر ہے وصل یار بھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں سدا عیش دوران دکھاتا نہیں
خوشا وہ زمانہ کہ دو اک جگہ کریں یکدگر جلوہ مہر و مہ ..... وغیرہ انھیں میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو دو سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو دانوں کی تقریروں یا تحریروں میں استعمال ہوتے آ رہے ہیں۔

(۲) ایک دوسرے موقع پر بھی جبکہ بدر منیر کی شرم اسکو بناؤ سنگار کرنے سے روک رہی تھی نجم النسا اس کے دلی رجحانات کو تاڑ لیتی ہے اور ایک اجنبیت کے ساتھ اس طرح کہ بدر منیر کے دل میں کس قسم کا خیال نہ گذرے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسکو باتوں میں الجھا کر کہتی ہے کہ میری بڑی خواہش ہے کہ آج تجھکو سنگار کرتے دیکھوں اور تیرے حسن کی بہار کے مزے لوٹوں۔ پہلے تو شہزادی بدر منیر کچھ بگڑ سی گئی لیکن یہ تصنع آخر کار نجم النسا کی اطاعت میں بدل گیا۔

(۳) تیسرا موقع وہ ہے جبکہ شہزادی ابھی بے نظیر سے کھلی نہ تھی اور نہ اس کی شرم اسکو کھلنے دیتی اگر نجم النسا کی عقل خداداد اسکو یہ ترکیب نہ سمجھاتی کہ بدر منیر کی شرم کو دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اسکو شراب پلا کر مدہوش بنا دیا جائے چنانچہ نجم کی یہ ترکیب بنا کام کر گئی

ہر قسم کے عرقیات اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے۔

(۴) وہاں بھی نجم النسا نے بڑے نفسیاتی نکتے سے کام لینا چاہا جب بدر منیر نے بے نظیر کے فراق میں اپنا حال تباہ کر رکھا تھا نجم النساؑ کا خیال تھا کہ اگر شہزادی کے دل پر بینظر کی بیوفائی کا نقش جما دیا جائیگا تو اس کی حالت میں اصلاحی تغیر ہو جائیگا۔ اس موقع کی تصویر بھی خود میر حسن کے الفاظ میں پیش کر دی گئی ہے وہ بدر منیر کو سمجھاتی ہے کہ بے نظیر کی محبت ایک مسافر کی محبت تھی اسپر اعتماد کرنا غلطی ہے اگر محبت استوار ہوتی تو کبھی وہ بے سبب تجھکو اس طرح مفارقت کے غم میں مبتلا کر کے خود پری کے ساتھ مزے اڑاتا نہ رہتا۔ یہ تیری بدقسمتی تھی کہ تیرا دل آیا بھی تو ایسے بیوفا پر جو "جہاں بیٹھا وہیں کا ہو رہا" اپنی حالت ایسے شخص کی جدائی میں تباہ کرنی مناسب نہیں ہے جو اپنی طرف سے بھی کچھ محبت کا اظہار کرے نہ ایسے شخص کے لئے جسکو تم جتنا اپنی طرف "کھینچو" اور کھنچتا جائے

نجم النسا کی یہ چال اس لئے نہ چل سکی کہ شہزادی کی محبت بے نظیر کیساتھ عشق کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھی جہاں وہ لاعلاج ہو جاتی ہے اور جہاں تک ترقی کرنے کے بعد محبت، فریق ثانی کی طرف کے جواب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔ بدر منیر، نجم النسا کی قیاسی دلائل کے مقابلے میں نہایت قوی، اور یقینی عذرات پیش کرتی ہے۔ اس دفعہ تو بدر منیر کو بہ حیثیت اس کے وہ اصل شخص قصہ ہے، ضرور کامیابی ہونی چاہئے تھی، اس کی کامیابی ہی قصے کو آگے لیجانے کا باعث ہوتی ہے۔

(۵) نجم النسا کی غیر معمولی ذہانت، اور عقلمندی کا مہتم بالشان ثبوت قصے کے اس حصے میں ملتا ہے جہاں اُسنے اپنے دلدادہ فیروز شاہ سے کام لینے کا عجیب ڈھنگ اختیار کیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ فیروز شاہ سے ایک ایسی خدمت لینی ہے کہ جسکی اہمیت اسوجہ سے زیادہ ہو گئی تھی کہ فیروز کو خود اسکے ایک ہم جنس سے مقابلہ کرنے پر ابھارنا تھا۔ نجم النسا کے تجاہل عارفانہ نے فیروز شاہ کے دل میں جوگن کے متعلق نہایت بلند خیالات پیدا کر دئے وہ اسکو بے پروا، مستغنی اور ایک ایسی چیز تصور کرنے لگا جسکا حاصل ہونا آسان کام نہیں۔ جب اس کے دل میں اس قسم کے نقوش تاثر بیٹھ گئے، تو اس کے دو نتائج نجم النسا کے حسب مقصد پیدا ہونے ضروری تھے ایک تو یہ کہ فیروز کی الفت کا جذبہ قوی تر ہوتا گیا، اور اس لئے وہ نجم کی تمام پیش کردہ شرائط پر کاربند ہونے کیلئے تیار نظر آنے لگا۔ اس طرح نجم النسا کی ہوشیاری اس کی عظیم الشان مہم کو کامیاب بنانے کی ایک وجہ بن گئی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایک خواب کی واہمی کی بنیاد پر نجم النسا کا ایسی عظیم الشان مہم کے سر کرنے پر آمادہ ہو جانا کہاں تک اس کی عقلمندی اور ذہانت کے مطابق تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ خواب کی بے ثباتی ضرب المثل ہے تاہم خواب کو محض بے بنیاد سمجھنا صحیح نہیں۔ ٹنی سن نے بھی اپنے قصے "اینک آرڈن" میں اس قسم کا عنصر شامل کیا ہے۔ چنانچہ اینی لی صرف خواب ہی کی بنا پر اینک آرڈن کو مردہ تصور کرتی اور فلپ کے ساتھ عقد کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں اس امر کا لحاظ رہے کہ اینی لی نے اپنے خواب کے اشاروں کا مفہوم غلط سمجھا تھا۔ وہ اینک آرڈن کو ایک ٹیلے پر تار کے درخت کے نیچے بیٹھا پاتی ہے جسکو وہ جنت کا درخت اور سورج کی منور شعاعوں کو حضرت عیسیٰ کا نور تصور کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے اینک فردوس میں ضرور حضرت عیسیٰ کی معیت میں بسر کر رہا ہے۔ لیکن بدر منیر کا خواب واضح ہونے کی وجہ سے اگر نجم النسا نے اسکو صحیح اشارہ سمجھا تو یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی ٹنی سن کے شارحین "اینک آرڈن" کے خواب کے عنصر پر بحث کرتے کرتے خود خواب اور ان کے فلسفے کے متعلق کافی ادب پیدا کر چکے ہیں ہم بھی آئندہ میر حسن کے اس خیال پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہپناٹیزم کی رو سے کسی شخص کا اپنے خیالات کے

کارخانۂ قدیم اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگانا چاہیے

مرکز کو اسکی سچی حالت میں مشاہد کرنا ناممکن نہیں ہے۔

(۸)

نجم النساء کے معرکتہ الآرا کردار کی تمام خوبیاں متذکرہ بالا صفات ہی پر ختم نہیں ہو جاتیں اس فہرست میں ہم ایک اور خصوصیت کا اضافہ کرتے ہیں جو اسمیں بدرجہ اتم موجود ہے اور جس سے وہ بڑے نازک موقع پر کام لیتی ہے یہ اسکی موسیقی دانی ہے۔ ایک عمدہ کردار کو پوری کامیابی حاصل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصنف اس کے تعارف کیوقت ہی اس کا ایک ایسا خاکہ (نکہ مکمل تصویر) پیش کردے کہ بعد میں جس قدر صفات وہ اس کردار سے منسوب کرنا چاہتا ہے ان سب کے اثرات اسی میں مضمر معلوم ہوں۔ یا کم سے کم ہر نو پید اصفت ایسی ہو کہ اس کے کردار زیر بحث سے منسوب کئے جانے سے کوئی تکلف یا کردار کی سرشت کیساتھ منافات نہ ظاہر ہو۔ ہر موقع کی مناسبت سے کردار میں ایک نئی صفت کا اضافہ کردینا کردار نگاری کا عیب ہے۔ کیونکہ یہ چیز اشخاص قصہ کو قصہ نگار کے ہاتھ کی کٹ پتلی بنا کر ان کو غیر فطری اور غیر اہم بنا دیتی ہے میر حسن نے نجم النساء کے تعارف کے وقت اسکے اس خاص وصف کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تاہم اس کی سرشت میں "ستارہ سی" اور "قیامت شریر" ہونیکی دو ایسی جامع اور لچکدار خوبیاں رکھدی ہیں کہ نجم النساء کا کردار اسوقت بھی مصنف کے ہاتھ کی کٹ پتلی نہیں معلوم ہوتا، جبکہ وہ پرستان میں اس کے کمالات موسیقی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ عموماً مغل شاہزادیاں اور امیرزادیاں (اور اسی لئے وزیرزادیاں) رقص و سرور کی بڑی دلدادہ تھیں۔ ان کی ذاتی گائیکوں کے علاوہ وہ خود بھی بعض وقت نہایت باکمال موسیقی داں ہوتی تھیں۔ اگر وزیرزادی اور وہ بھی نجم النساء کی فطرت والی اس کمال سے متصف ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ لیکن میر حسن کے بیانات سے نجم النساء کے کمال موسیقی دانی میں سوائے ایک تصوری کمال کے کسی ممتاز خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۴۹ سے ۵۰ تک) شاید وہ بین پر کدارا خوب بجا سکتی تھی۔ گو ان مقامات میں جہاں میر حسن نے پیشہ ور گائینوں کی تصویریں پیش کی ہیں ایسی وافر معلومات کا ثبوت دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی ساری عمر انھیں کی رازداں اکے سیکھنے میں بسر کی ہے

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نجم النساء اپنی موسیقی دانی سے نہایت شائستہ خدمات لیتی ہے۔ مغلوں کی حکومت ہند کے زمانے میں ایک شخص کا محض موسیقی دانی کی بدولت عزت ثروت اور شہرت پانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تان سین اور بیجو باورے کے نام آج تک ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مطرب شعرا کو درباداری نصیب ہو چکی ہے۔ نجم النساء کا موسیقی دانی بدولت جنوں کے بادشاہ اور فیروز شاہ کے باپ کے دربار تک پہونچنا اور ان کے دلوں کو مسخر کرلینا میر حسن کا اپنے ماحول کی ترجمانی کرنا۔

(۹)

ایثار، ہمدردی اور خود فراموشانہ دوستی نجم النساء کے کردار کے اعلیٰ صفات ہیں۔ یہ چیزیں اس کے کردار میں جتنی زیادہ مضمر ہیں اسیقدر اس کو انسان کا ایک بہترین اور زیادہ مکمل نمونہ بنا رہی ہیں۔ بدر منیر کے ساتھ نجم النساء کی رفاقت ہمدردی اور ایثار دوستانہ خود فراموشی کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ اگر اس کا قدم درمیان نہوتا تو ہمکو یقین ہے کہ بہ حالات موجودہ قصے کا خاتمہ بجائے طربیہ کے کچھ اور ہوتا

گاد عطر صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

اگر ہم الفاظ قانونی کے غلط استعمال کے مرتکب نہ سمجھے جائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نجم النسا ہر امر میں بدر منیر کی نہ صرف مشیر کار ہے بلکہ کارندہ بھی۔ اور یہ کارندگی نفس قصہ سے جہاں تک متعلق ہے معمولی معاملات کی نسبت نہیں بلکہ خود معاملات عشق کی نسبت ہے اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بدر منیر کا قائمقام بناکر معاہدات عشق کی تکمیل کرتی ہے بلکہ اس سے ہماری مراد صرف اس قدر ہے کہ اسکی ہمدردی ایسے کاموں میں بھی اسکو بدر منیر کی نیابت پر مجبور کرتی ہے جو عام طور سے فریقین عشق انجام دیتے ہیں چنانچہ بدر منیر کیلئے بجائے بدر منیر کے وہ خود بے نظیر کو ڈھونڈنے نکلتی ہے اور یہی اس دشوار کام کے لئے بدر منیر سے زیادہ موزوں بھی تھی جیساکہ ہم نے ابھی اوپر کہا ہے قصے میں نجم النسا کی زندگی ایک قطعی خود فراموشانہ دوستی کا عمدہ نمونہ ہے بدر منیر کے ایک خواب اور پری کے ساتھ بے نظیر کے تعلقات کی بنا پر اسکا ذہن رسا اس کو اس خیال تک صحیح طور سے پہونچا دیتا ہے کہ ضرور کسی نہ کسی طرح پری کو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات کا حال معلوم ہو گیا ہے اور کیا تعجب ہے کہ پری کا جذبۂ انتقام بے نظیر کے حق میں زندان مصیبت ثابت ہوا ہو۔ بس اسی قیاس پر وہ ایک مہتم بالشان مہم کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص، کسی رفیق کی ہمدردی اور مدد کے لئے وہاں تک تیار ہو جائے جہاں تک کہ ایسی مدد خود اس کے مفاد سے نہ ٹکراتی ہو۔ لیکن اپنے مفاد کو پس پشت ڈالکر بھی دوسرے کی مدد کرنے پر قائم رہنا درحقیقت ایک عظیم الشان ایثار ہے۔ اس ایثار کی حقیقی عظمت اس وقت تک کماحقہ ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک اس امر کا تصفیہ نہ ہو جائے کہ آیا نجم النسا کو اُسکے عاشق فیروز شاہ کے ساتھ الفت بھی تھی یا نہیں؟ اگر اس کو الفت تھی اور اس کے بعد اس نے فیروز سے شادی کرنیکا وعدہ کیا تھا۔ تو اس کے ایثار کی اہمیت صرف اس قدر ہوگی کہ اس نے بجائے فیروز شاہ کی محبت میں محو ہو کر ایک مسرت بخش پر لطف زندگی بسر کرنے کے اپنے خود اختیار کردہ فریضہ کی تکمیل کرنی ضروری سمجھی اور اس وقت تک اپنے آپ کو ہر قسم کی نعمتوں سے محروم رکھا جب تک ہیرو اور ہیروئین میں مواصلت نہ ہو چکی۔ لیکن اگر متذکرہ بالا سوال کا جواب نفی میں دیا جائے تو نجم النسا کے ایثار کی عظمت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بدر منیر کی دوستی کے ہاتھ بیچ دیتی ہے اور اپنی ذات کے متعلق ہر قسم کے مفاد کو بدر منیر کے آرام پر قربان کر کے فیروز شاہ سے اس امر کا عہد کر لیتی ہے کہ اگر وہ بے نظیر کو تندرست واپس لائے تو وہ اسکی ہو جائیگی۔ ایسا عہد درحقیقت اس کے لئے زندگی میں موت ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس امر میں قطعی فیصلہ صادر کریں بہتر ہوگا کہ نجم النسا اور فیروز شاہ کے تعلقات پر غور کریں کہ آیا نجم النسا کو بھی فیروز شاہ سے الفت تھی یا نہیں۔

میر حسن کے جملہ بیانات میں صرف ایک مصرعہ اور وہ بھی عام نوعیت کا ایسا ملتا ہے جس سے نجم النسا کی الفت کا پتہ چل سکتا ہے ؎

"وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر"

لیکن اس مصرعہ سے بجائے اس کے کہ نجم النسا کی الفت ظاہر ہو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیروز شاہ کی للچائی ہوئی نظروں سے غافل نہ تھی اس مصرعہ کے سوا خود میر حسن نے اس امر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا کہ نجم النسا کو بھی فیروز شاہ سے محبت تھی خود نجم النسا کے افعال یا کلمات سے اسکی محبت کا بالکل پتہ نہیں چلتا کیونکہ کہیں بھی اس نے محبت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہر جگہ فیروز شاہ کے معاملے میں ستم ظریفانہ طرز روش اختیار کرتی رہی ہے ہم اسکے دل کی صرف ایک منفی کیفیت کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکو فیروز شاہ سے نفرت نہ تھی۔ اس لئے اسکی بساط ماحول پر نظر کرتے ہوئے ہم یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ نجم النسا کا ایثار حاتم طائی کے افسانوی ایثار یا ڈکنز کی ذہنی مخلوق سڈنی کارٹن کے عظیم الشان ایثار سے کم نہیں کہلایا جا سکتا۔

انشائی قوام کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے۔

(۱۰)

آخر میں نجم النسا کے بعض خیالات پر بھی ہم کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ وہ دنیا کے واقعات پر غور و فکر بھی کرتی تھی اور اسکی نظر تنقیدی بڑی تھی چنانچہ ہم کسی فصل میں نجم النسا کے ان خیالات کا اعادہ کر چکے ہیں جو اُسنے بے نظیر کی بیوفائی کے تذکرہ میں عام جنس مخالف کے متعلق ظاہر کئے تھے۔ نجم النسا کا خیال تھا کہ مرد کی ذات بیوفا، متلون مزاج اور سخت دل ہوتی ہے

ارے چار دن کے ہیں یہ آشنا | ملا دل کو آخر کرے ہیں جُدا | گئے آسمان گہ زمین کے ہیں یہ | جہان بیٹھے جا بس وہیں کے ہیں یہ
وہ خوش ہوگا اپنی پری کو لئے | عبث اپنے بیٹھی ہو تم جی دئے | تمھاری اسے چاہ ہوتی اگر تو | تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر؟

اسکا خیال تھا کہ محبت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔

سنو جانی اپنے پہ جو کوئی مرے | تو دل بھلے اپنا بھی صدقے کرے | اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو تو | تو پھر چاہئے اس کی پروا نہ ہو

اگر متذکرہ بالا بیانات نجم النسا کے خیالات کی واقعی ترجمانی سمجھی جائیں، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نجم النسا عملاً بھی ان خیالات کو اہم سمجھتی تھی کیونکہ اس کے خیالات کا آئینہ خود اس کا طرز عمل ہے جو اس نے فیروز شاہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مرد ذات کے متعلق اسکی بدگمانی ہی نے اسکو فیروز شاہ کا کڑا امتحان لینے پر ابھارا ہو؟ اور کیا ہم اس خودداری کو جو اُسنے فیروز شاہ کی ملاقاتوں کے دوران میں قائم رکھی اسکے دلی خیالات اور نظریات کا عملی مظہر نہیں کہہ سکتے؟ حقیقت میں نجم النسا کی حیات کا وہ حصہ جو فیروز شاہ کی ملاقات کے بعد سے شروع ہوتا ہے ایک عجب انفرادیت رکھتا ہے۔ جسکی وجہ سے نجم النسا کا کردار "سحر البیان" کے دوسرے اشخاص قصہ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں واقعی اور زندہ نظر آنے لگتا ہے۔ نجم النسا کی بساط تفکر میں حیات کے متعلق بھی چند خیالات موجود ہیں وہ سمجھتی ہے کہ زندگی حظ اٹھانے اور عیش و عشرت میں گزارنے کیلئے ہے۔ ذیل کے اشعار اسکے اس خیال کی توضیح میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

غم دین و دنیا فراموش کر | مے عیش کا جام اب نوش کر | مزہ دیکھ اپنی جوانی تو لو | ملک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو لو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں | سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں | یہ جوبن کا عالم رہے یادگار | کہاں یہ جوانی کہاں یہ ابھار
. . . . | . . . . | "وہے حاصل عمر ہے وصل یار | سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار
شب و روز پی مل کے جام شراب | مہ و مہر کو رشک سے کر کباب

ان اشعار کا اگر ان خیالات سے مقابلہ کیا جائے جو اے پی کیورس کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں اور اس کے فلسفہ کا ماحصل تصور کئے جاتے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ نجم النسا کے خیالات درحقیقت اے پی کیورس کے ان خیالات کی ترجمانی اور تشریح ہے۔

Eat, drink & be merry, for tomorrow we may die

یعنی "کھاؤ، پیو اور خوش رہو کیونکہ ہم کل مرنے والے ہیں"

محمد عبدالقادر سروری ایم اے

کارخانہ سید علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ اشتہار کا پتہ حنا لکھنو کافی ہے

حشر آرزو

(فسانہ)

(۱)

"اس کا کیا علاج ہے؟" مشتاق کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی میں یکبارگی چونک اٹھا دیر سے ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ میری خاموشی کا باعث مشتاق کا وہ حیرت انگیز سکوت تھا جو کبھی کبھی اس پر طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن آج مشتاق کے تخیلات میں جو اضطراب و تلاطم تھا۔ وہ کچھ اس جملہ سے مترشح تھا۔ بارہا اتفاق ہوا ہے کہ مشتاق باتیں کرتے کرتے رک گیا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ بے اختیاری میں اس کی زبان سے "یہ کیا ہوا" "کیا مشکل ہے" نکل گیا ہے۔ لیکن "اس کا کیا علاج" وہ جملہ تھا جسکو مشتاق جیسے آدمی سے میرے کان سننے کے نہ خوگر تھے نہ متوقع۔ میں نے سامنے نگاہ اُٹھائی مشتاق اب بھی سگریٹ کے کش لے رہا تھا دھواں فضا میں بے ربطی کیساتھ چکر لگا رہا تھا شاید مشتاق کے بے ربط و پراگندہ خیالات سے وہ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ میں کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ اسکی نگاہیں مجھ سے ملیں جو مجھ سے حاکمانہ انداز میں ملتجی تھیں کہ خدا کے لئے مجھے اسوقت میرے حال پہ چھوڑ دو۔ مجھے پھر جرأت نہ ہوئی کہ کچھ دریافت کروں دس پندرہ منٹ یونہی گزر گئے۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ کچھ پوچھوں مگر اسکی ساکت کر دینے والی نگاہیں یاد آجاتی تھیں — بڑی مشکل سے دل کو یہ سمجھا کر سوال کیلئے آمادہ کیا کہ ممکن ہے گفتگو سے مشتاق کی یہ صبر آزما حالت کسی دوسری بہتر حالت سے بدل جائے اب یہ دقت پڑی کہ کن الفاظ میں اسے مخاطب کیا جائے مشتاق جس عالم میں رہا ہو اب تو میں اسکی بدولت خود بھی بلاوجہ پریشان ہو چلا تھا جی اٹھکر وہاں سے چلا جاتا مناسب سمجھا۔ لیکن مشتاق کی نگاہیں پھر مجھ سے دوچار ہوئیں اور اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا "ابھی مت جاؤ" مجھے ٹھہرنا پڑا اور اب یہ مسئلہ بھی حل ہو چکا تھا کہ مشتاق کو کیونکر مخاطب کیا جائے میں نے بیٹھتے ہی پوچھا "تمھاری حالت کیا ہے" جواب میں وہ مجھے بے معنی نگاہوں سے دیکھا کیا میں بھی جواب الجواب میں مجسم سوال بنکر خاموش رہا میری یہ ادا بیکار نہیں گئی۔ مشتاق نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں اسوقت مسز چیٹرجی کے ہاں سے چار بجے کر آ رہا ہوں؟"

مسٹر چیٹرجی الہ آباد میں تاریخ کے پروفیسر تھے میں ان کے حالات کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں رکھتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ سناتن دھرم کو چھوڑ کر پہلے برہمو سماج میں داخل ہوئے اور اب دین مسیحی کے پیرو ہیں۔ مسز چیٹرجی بالکل انکی ضد واقع ہوئی ہیں۔ انکو قصہ ہائے پارینہ سے دلچسپی ہے اور اسی میں محو رہتے ہیں۔ مگر مسز چیٹرجی ان سب چیزوں کو مردہ سمجھکر قابل اعتنا نہیں سمجھتیں ان کو بس نیرنگ ہائے امروز سے سروکار ہے ان کی علمی استعداد کچھ زیادہ نہیں سنا گیا ہے کہ انٹرنس تک تعلیم پائی ہے مگر وہ عورت ہے اور وہ بھی بنگالی عورت عورت کو فطرت خود تعلیم دیتی ہے۔ انسانی تعلیم اس کو نسائیت کی ملکوتیت کو حیوانیت سے پست تر کر دیتی ہے۔ عورت طنز مجسم ہے اور بنگالی عورت کا طنز تو سحر بنگالہ کی خاصیت رکھتا ہے جو نیش کو نوش کر کے ہلاہل سے زیادہ مہلک بنا سکتا ہے۔ مسز چیٹرجی حسین بھی ہیں یا نہیں؟ اس کے متعلق میں خود کچھ نہیں جانتا۔ بعد کو مشتاق ہی کی زبان سے معلوم ہوا کہ وہ پوری بنگالی عورت ہے جس کے بدن کا کوئی حصہ اپنی جگہ معیار حسن پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن خدا ہی

نہایت دیرپا خوشبو کے عطر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

جانتا ہے کہ یہ جسمانی نقایص بحیثیت مجموعی ایک بنگالی عورت کو پیکرِ حسن بنا کر خطرناک حد تک کیونکر دلکش پیدا کر لیتے ہیں۔ مشتاق اسی "سحرِ بنگال" کا شکار ہو چکا تھا۔

(۲)

مشتاق کی بابت عام طور پر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک لاابالی مغرور اور وحشی آدمی ہے۔ میری اور مشتاق کی ملاقات بچپن ہی سے شروع ہوئی تھی جب ہم دونوں رنج و غم سے آزاد فکر دنیا سے ناآشنا ایک دوسرے کیساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ہماری طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ اگر تیز و طرار تھا تو میں خاموش اور کاہل۔ باینہمہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے اسے بھی نفرت تھی اور مجھے بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم دونوں کو کبھی دوسرے لڑکوں کی صحبت میں لطف آیا ہو ہماری نظروں میں الہ آباد میں کوئی ایسا لڑکا تھا ہی نہیں جو ہماری توجہ کا مستحق ہوتا یعنی ہم سب کو جاہل سمجھتے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ایک عرصہ کیلئے۔ جب ہم انٹرنس میں تعلیم پا رہے تھے تو میں سلطانپور ہائی اسکول میں تھا۔ اور وہ اپنے وطن الہ آباد میں۔ امتحان کے بعد چھٹیوں میں ہمکو پھر ایک دوسرے سے الہ آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ میری اور مشتاق کی تربیت بالکل دو جداگانہ اصول پر ہوئی تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو ہمیں کشاں کشاں ایک دوسرے سے قریب تر کر رہی تھی۔

الہ آباد میں مجھے معلوم ہوا کہ مشتاق اسوقت عالم سفلی کی سیر کر رہا ہے اس نے بلا سوچے سمجھے اپنے کو دنیا کی گمراہ کرنے والی آزمائشوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا افسوس ہوا میں جانتا ہوں کہ وہ ان سب پستیوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے اور خوانخواہ اپنے جوہر اصلی کو آلودہ کر کے مٹا رہا ہے لیکن اس زندگی میں جسے لوگ عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں اسکو سکون نہ ملا۔ مشتاق ایک عجیب بے قرار طبیعت کا انسان تھا اس نے دنیا کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسکی فطری بے قراری میں کوئی کمی نہ ہوئی یہانتک کہ اس نے اپنی خودی کو فراموش کرنے کے لئے دختِ رز کو بھی منہ لگایا لیکن وہ بھی اسکی غمگسار نہ بن سکی۔ اب مشتاق دنیا کی دلچسپیوں کی حقیقت سمجھ چکا تھا۔ اور شاید یہی زمانہ تھا جب تاہل کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں ڈالدی گئی تھیں مشتاق اُن پاگلوں میں نہ تھا جو گریبان چاک کر کے صحرا کی راہ لے لیتا۔ اس نے شہر ہی کو صحرا سمجھا اور اپنی وحشت کی ساری جولانی اپنی ہستی کو ابھارنے میں صرف کر دی اور اسمیں شک نہیں کہ وہ ایک غیر معمولی ہستی ہو کر رہ گیا لوگ اُسے وحشی اور مغرور سمجھنے لگے میرا خیال ہے کہ مشتاق خوددار، غیور اور ایک انوکھا آدمی ہے اسکی جرأت دائرۂ اعتدال سے باہر ہوتی ہے اور عرفی کا یہ شعر جسکو وہ اکثر پڑھا کرتا ہے اسکے خیالات کی کافی ترجمانی کرتا ہے ؎

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطون باش
کہ گر میانہ گزینی سراب تشنہ لبی است

خود مشتاق کی اپنی بابت یہ رائے ہے کہ مجھے سوئی کی جگہ نشتر چبھونے سے زیادہ تسکین ہوتی ہے۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشتاق نے اپنی جوشِ طبیعت کے تقاضہ سے دنیا کا ہر علم حاصل کرنیکی کوشش کی چنانچہ اس نے کالج میں کبھی تو فلسفہ و تاریخ پڑھی کبھی اقتصادیات اور ریاضیات اور کبھی طبعیات اور کیمیا وغیرہ۔ اور ان سب علوم میں اسکو کافی دستگاہ حاصل تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ اور مکالمہ میں کوئی شخص اس کے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک پروفیسر صاحب اس کے درجے میں طبعیات پر لکچر دے رہے تھے مشتاق متوجہ نہ تھا اس کی نگاہیں سامنے میدان میں جہاں ایک گھسیارہ جون کی دوپہر کی دھوپ میں گھاس کھود رہا تھا جمی ہوئی تھیں گھسیارے کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ پروفیسر صاحب کو یہ دیکھکر ناگوار ہوا کہ میں تو اپنا سر کھپا رہا ہوں اور طالب علم میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ انھوں نے ذرا تند ہو کر کہا "مشتاق اگر تم متوجہ نہیں ہوتے تو کمرہ سے باہر چلے جاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سامنے

ہر قسم کا روغن کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائے

میدان میں کونسی ایسی دلچسپی ہے کہ تم حرارت جیسے اہم مسئلہ کی طرف سے غافل ہو۔ اگر تم نے آج میرا لکچر نہ سنا تو پھر کبھی اس کا موقع نہ ملے گا اور امتحان میں حرارت یا مقیاس الحرارت سے متعلق جتنے سوالات آئیں گے اُن کے شافی جوابات تم نہ دے سکو گے"۔ مشتاق نے اس کو اپنی توہین سمجھی اور ترشی کیساتھ بول اٹھا "آپ اس کمرہ میں بیٹھکر جہاں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں اور برقی پنکھا چل رہا ہے طبیعیات کا سبق دے رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں اسوقت حرارت فلاں درجہ پر ہے آپکے پاس اسکا کوئی ثبوت بصرف مقیاس الحرارت آپکے دعوی پر حجت ہے آپ کیا جانیں کہ حرارت کس چیز کا نام ہے اور اس کے درجات کیا ہیں وہ سامنے گھسیارے کو دیکھئے۔ اسکو البتہ حرارت کا کماحقہ علم ہے۔ اسلئے کہ وہ اسکی اثر اپنے جسم کے ریشے ریشے میں دوڑتی ہوئی محسوس کر رہا ہے جس شے کو آپ محسوس نہیں کرتے اس کی بابت کوئی قطعی حکم کیونکر لگا سکتے ہیں"

پروفیسر صاحب بہت خفیف ہوئے اور بولے "اچھا تو میرا کلاس چھوڑ دو" مشتاق کی یہی ذہنیت تھی جس کا ایک زمانہ شاکی تھا اور جو ہمیشہ اور ہر موقع پر نمایاں رہتی تھی۔

یہی مشتاق صاحب کی زبان سے آج یہ مبہم جملہ نکل گیا تھا کہ "اسکا کیا علاج" اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ مسز چٹرجی نے اُسے چار کی دعوت دی تھی۔ خدا جانے کیا واقعات پیش آئے تھے کہ مشتاق جیسے زوردار آدمی نے ہتھیار ڈالدیا۔ اب مجھے یاد آیا کہ ایک دن پیشتر مشتاق کے پاس ایک تحریر آئی تھی جسمیں صرف اس قدر لکھا تھا کہ کل تمھیں چار بجے یہاں چار کی دعوت میں شریک ہونا ہے" اس انداز حکومت سے مسز چٹرجی کی قوت کا خیال شاید کیا جاسکے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مشتاق کی ساری قوتیں سلب ہوگئی تھیں۔ وہ شخص جسکی سوئی اوروں کیلئے نشتر ثابت ہوتی تھی ایک عورت سے اتنا سراسیمہ ہوجائے! یہ ایک حیرت کی بات ہے۔ مجھے مزید حالات سننے کا اشتیاق ہو گیا

مشتاق تو غالباً اسی جملہ پر ختم کر دینیوالا تھا کہ "تم جانتے ہو کہ میں اسوقت مسز چٹرجی کے ہاں سے چار پیکر آرہا ہوں" لیکن میرے منہ سے نکل گیا "وہ پھر کیا چار میں زہر ملا تھا کہ تمھاری حالت متغیر ہوگئی ہے"۔ مشتاق نے مجھکو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں باوجود انتہائی بے تکلفی کے نادم ہوگیا۔ اور اپنی ندامت کو خواہ مخواہ کی مصنوعی مسکراہٹ سے چھپانا چاہا۔ سلسلہ کو جاری رکھنے کی اب میرے پاس کوئی تدبیر نہ تھی۔ مگر خیریت ہوئی کہ مشتاق نے خود ہی گفتگو شروع کر دی "تم پوچھتے ہو کیا چار میں زہر ملا تھا؟ ہاں وہ زہر ہی تھا جو چار کی صورت میں مجھے پلایا جا رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ اس عورت سے دور رہوں مگر............" مجھ سے نہ رہا گیا میں بات کاٹ کر بولا "پھر تم دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر سکتے تھے"۔

"انکار کر سکتا تھا؟ ذرا اس تحریر کے تیور تو دیکھو۔ تمھیں کل چار بجے چار پر شریک ہونا ہے۔ اُس شریک ہونا ہے کا کیا علاج؟ کیا انکار محض اس کا جواب ہوسکتا تھا۔ میں تو انکار میں یہ قوت نہیں دیکھتا کہ مسز چٹرجی کے اس جملے کے سامنے ٹھہر سکے۔ دعوت کاہیکو ہے، وہ ندا کا طلب نامہ ہے" مجھے افتاں و خیزاں جانا پڑا مجھے مسز چٹرجی کی قوت آزادی کھینچ کر لیگئی۔ میں مسحور کر لیا گیا۔ بغیر شریک ہوے مجھکو کوئی چارہ کار نظر نہ آیا"۔ مشتاق یہ کہہ رہا تھا اور میری نظر اس کے چہرہ پر تھی جو اس طوفان کا آئینہ دار تھا جو اس کے دماغ میں برپا تھا۔ بہرحال میں گیا۔ مسٹر چٹرجی نے مجھے تپاک سے بٹھایا۔ یہی ایک پروفیسر تھے جو ایام طالبعلمی میں میرے ہمدرد اور مداح تھے۔ آج بھی وہ اپنے شاگرد کو دیکھکر خوش ہوئے۔ مسز چٹرجی ابھی تک میز پر نہیں آئی تھی محض اس کی آمد کی تصور سے میں اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا۔ مسٹر چٹرجی میری طبیعت سے بزعم خود واقف تھے۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن مجھے متوجہ نہ پاکر خاموش ہو رہے۔ اتنے میں سامنے کے پردہ کو جنبش ہوئی اور وہ وقت بھی آگیا جسکا

کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کو قائم ہوئے سو سال سے زیادہ ہوگئے

میں سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مسز چٹرجی نے آتے ہی مسٹر چٹرجی کو سامنے ایک طنز آمیز تبسم کے ساتھ میرے آنے پر اظہارِ مسرت کیا۔ یہ مسرت گویا میری شکست پر فاتحانہ مسرت تھی۔ مگر اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسری دنیا میں ہے۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا چاء کا دور چلنے لگا۔ مسز چٹرجی میری پیالی میں چاء ڈال رہی تھیں۔ انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا خیال کہیں اور ہے۔ میں اس کہیں اور سے واقف تھا۔ اس نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے ایک خفیف لغزش کیساتھ میری پیالی میری طرف بڑھائی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسکی بیخود کرنے والی نگاہیں بھی چاء میں حل ہو گئی ہیں۔ میری عجیب کیفیت تھی نظریں نیچی پیالی منہ سے لگی ہوئی اور گرم چاء ایک عالمِ بیخبری میں میرے حلق سے نیچے اترتی جاتی تھی۔ مسز چٹرجی کا لب زیریں اس کے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ پلکیں تیر کی طرح سیدھی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلہن اتر کر رہی گی۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میرا دماغ مختل تھا۔ میرے حواس کا شیرازہ بکھرا ہوا معلوم نہیں کب تک میری یہ حالت رہی کہ ایکبار مسٹر چٹرجی کی آواز سنائی دی "مسٹر مشتاق معاف کرنا آج مجھے کلب میں ٹینس کھیلنے جانا ہے" کلب کا نام اچھی طرح میں سن بھی نہ سکا اور خوش ہو کر اٹھا کہ اس آزمائش گاہ سے کسی طرح رہائی ملی۔ لیکن اسی کے ساتھ مسز چٹرجی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "نہیں مسٹر مشتاق ابھی نہیں جائیں گے"۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے یہ معلوم ہو سکا کہ میں نہیں گیا اور ایک کرسی پر مسز چٹرجی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ درمیاں میں میز حائل تھی۔ مسز چٹرجی کی زبان سے "مسٹر مشتاق" سن کر میں مشتاق بھی نہ رہا تھا"

میں ہمہ تن گوش ہو رہا تھا اور یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھا کہ آخر بات کیا ہوئی جو آج مشتاق کے منہ سے بیساختہ "اس کا کیا علاج" نکل گیا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گزر گیا۔ مشتاق نے اپنے پریشان بالوں کو ناحق ہاتھوں سے درست کرنے کی کوشش کی میں مشتاق کی زبان سے آگے کے حالات سننے کا متمنی تھا۔ میں نے دیکھا کہ مشتاق سگریٹ جلانے میں مشغول ہے اور شاید گزشتہ واقعات کو بیان کرنے کیلئے تیار ہو رہا ہے اس نے پھر ایک سانس لے کر کہنا شروع کیا "مسز چٹرجی نے جس وقت میرے نام کے آگے مسٹر کا اضافہ کیا میرے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے اور میری رگوں میں تشنج ہونے لگا"۔ میں نے مشتاق کی زبان سے آج پہلی بار سنا تھا کہ میرے رہے سہے حواس غائب ہو گئے۔ میں نے حیرت سے اس کو دیکھا مشتاق میرا مطلب سمجھ گیا اور کہا "ہاں وہ ایسی ہی خوفناک عورت ہے کہ میرے حواس بھی اسکے سامنے غائب ہو سکتے ہیں۔ تنہائی میں اس کے سامنے مجھ پر ایک قیامت گزر رہی تھی۔ اگر قیامت کسی جانکاہ ساعت کا نام ہے۔ مسز چٹرجی کے روبرو میری حالت اس مجرم کی سی تھی جو سولی کی سزا سننے کے لئے حاکم کے سامنے کھڑا ہو۔ آخرکار اسکے ہونٹ ہلے۔ اسکی بھنویں تنیں! اور میں ہمہ تن اس کے قابو میں ہو گیا۔ میرے کانوں میں پھر مسٹر مشتاق کی آواز آئی۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور مجھے اپنی پناہ میں لے لے یا پھر یہ عورت یہیں بیٹھی بیٹھی نیست ہو جائے میرے خیالات ابھی نہ جانے کتنے پہلو بدلتے کہ جملہ پورا کیا گیا "کہئے اس دوران میں آپ کن کن دلچسپیوں میں محو تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو کتنے دنوں بعد دیکھا ہے؟" اللہ! ان دو جملوں میں جو تاثرات تھے وہ میرے اعصاب میں ابتک ایک ہنگامہ بپا کئے ہوئے ہیں اسکی نگاہیں مجھے خاکستر کئے ڈالتی تھیں۔ ریاض تم اس عورت کو نہیں جانتے اسوقت یہ تذکرہ جانے دو میں اپنے دل میں تاب نہیں پاتا۔ پھر کبھی سن لینا کہ مجھ سے اور مسز چٹرجی سے کیونکر راہ و رسم پیدا ہوئی اور پھر کس حد تک

اصغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ میں بہت بڑی کوٹھی ہے

جب تک تم سارے واقعات نہ جان لو میری داستان سے کوئی نتیجہ نہ نکال سکوگے،" یہ کہکر مشتاق نے گردن جھکالی اور کھو یا گیا۔ میں بھی سلام علیک کہکر رخصت ہوگیا۔

(۳)

بیکاری کا زمانہ تھا الہ آباد سے ہم لوگوں کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ مشتاق کی رائے ہوئی کہ بے کیفی دور کرنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہئے ہماری پہلی منزل فیض آباد میں ہوئی۔

شام کا وقت تھا ہم گلاب باڑی کی سیر سے واپس ہو رہے تھے۔ نٹشے کے مافوق الانسان پر نہایت پرزور تنقید ہو رہی تھی کہ یکایک مشتاق ایک گلفروش کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ سے ایک ہار لیکر اس طرح سونگھنے لگا گویا پھولوں کی تمام خوشبو اپنی ہستی میں جذب کر لینا چاہتا ہو اسپر تماشہ یہ، کہ اس نے ہار خریدا نہیں بلکہ چند لمحوں بعد ہار بیچنے والے کو واپس کر دیا۔ میں نے کہا "یہ کیا وحشت تھی۔ اگر تمھیں ایسا ہی شوق تھا تو کوئی ہار خرید لیتے" مشتاق نے سنجیدگی سے کہا "آپ نہیں جانتے ملکیت کا تصور ہی ان نیم شگفتہ کلیوں کی دلربائیوں اور دلنوازیوں کو فنا کر دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس محبت کا قائل نہیں جو محبوب کو اپنا بنانے کی آرزو مند ہو چنانچہ میرے خیال میں مناکحت محبت کی نت نئی لذتوں کو زائل کر دیتی ہے۔ میری شریعت میں اگر کوئی گناہ ناقابل معافی ہے تو وہ محبوب کے ساتھ زوجیت پیدا کرنا ہے۔ محبت جیسی معصوم شے کو دنیا کے رسوم و قیود میں جکڑنا کیا معنی؟" میں نے دل میں کہا "بک لینے دو اسوقت سکوت ہی بہتر ہے"! ایمان کی تو یہ ہے کہ مشتاق کے عجیب و غریب نظریوں اور اس کے طریق استدلال سے عاجز ہوکر "جواب جاہلاں باشد خموشی" پر عمل کرنے لگا تھا۔ مشتاق کی عادت تھی کہ جب وہ میری گفتگو سے کچھ خوش نہ ہوتا تو مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگتا۔ آج بھی وہ میری دخل در معقولات سے کچھ مکدر سا ہوگیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیر تک مجھے اس کے طنز کا مقابلہ کرنا پڑا۔

چوک سے ہم نے یکہ کرایہ پر کیا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چلے۔ صانع نے جو غلطی یکہ بنانے میں کی تھی اس کا کفارہ آج ہم کو ہچکولوں اور دھکوں کی صورت میں ادا کرنا پڑا۔ مشتاق صبر نہ کر سکا۔ اس نے کہا "ریاض میری ایک بات ذہن نشین کر لو جب تک ہندوستانی یکہ کی صعوبتیں برداشت کر سکتے ہیں اسوقت تک سوراج پانے کا نہ ان کو کوئی حق ہے اور نہ سوراج مل سکتا ہے" میں ابھی اس کے جملے سے لطف اٹھا ہی رہا تھا کہ وہ یکہ سے کود کر سڑک پر ہو رہا اور یکہ والے کو دو آنہ پیسے دے کر بولا "میاں بس اب معاف کرو" میں نے دل میں کہا یا اللہ کس وحشی سے پالا پڑا ہے تقریباً آٹھ بجے رات کو ہم اپنی قیامگاہ کو ہو لئے۔ مشتاق ہمیشہ اپنے سفر و حضر میں برقی چولھا ساتھ رکھتا تھا۔ وہ تو چاء بنانے میں مصروف ہوگیا اور میں اسکی مصروفیت دیکھکر مسکرانے لگا مجھے مسز چٹرجی کی چاء یاد آگئی تھی۔ مشتاق نے کچھ دیر بعد میری طرف دیکھا تو مجھے آپ ہی آپ ہنستے ہوئے پایا۔ پہلے تو اس نے مجھے قابل التفات نہ سمجھا۔ لیکن آخر کار پوچھ بیٹھا "یوں بیکار ہنسنے کا مطلب؟" میں نے کہا بھائی مسز چٹرجی کی چاء یاد آگئی" یہ سنکر مشتاق کے چہرہ پر جو رنگ آگیا وہ کہہ رہا تھا کہ اگر اس وقت یہ تذکرہ نہ چھیڑا جاتا تو بہتر تھا وہ ایک بار پھر غوطہ میں پڑ گیا میں ابتک عورت اور اس کی قوتوں سے ناواقف ہوں۔ مشتاق کی صورت میرے سامنے تھی اور میں تعجب کر رہا تھا کہ عورت جو ایک "غبار ناتواں" سمجھی جاتی ہے اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ مرد کی غلامی کے لئے بنائی گئی ہے اپنے اندر کیسی کیسی طاقتیں پوشیدہ رکھتی ہے! اسکی قوت ارادہ اور قوت فعل کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا صرف تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ عورت کیا نہیں کر سکتی

عرق نعناع کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کیجئے

اگر وہ کرنے پر تل جائے ۔ اب مشتاق مجھے چائے پلا رہا تھا اور خود بھی پی رہا تھا لیکن ایک خیال تھا جو اسکی ساری ہستی پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا شاید اپنے ایک نادانستہ جملہ کے بدولت میں مشتاق کی اسی حالت کا مشاہدہ کر رہا تھا جو مسز چیٹر جی کے سامنے اسپر طاری ہوئی ہوگی۔ چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا ہاتھ میں لرزش تھی۔ اور وہ رہ رہ کر اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اسکی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "کیوں مشتاق تم کو ہوا کیا ہے اگر مناسب سمجھو تو مجھے بھی مسز چیٹر جی والی سرگزشت سنا دو"۔

مطلع ابھی صاف تھا دیکھتے دیکھتے ایک طرف سے بادل اٹھا اور سارے آسمان پر چھا گیا۔ ہوا میں فرحت بخش خنکی پیدا ہوئی اور تھوڑی دیر بعد بوندیں پڑنے لگیں۔ گویا ساری کائنات مشتاق کے تاثرات قبول کر رہی تھی۔ اور وہ فطرت اس کے واردات قلب کی آئینہ دار بن گئی تھی۔ میں نے کہا "مشتاق دیکھو اس وقت فطرت بھی تمہاری ہم آہنگ ہونا چاہتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی بس پردہ کسی ہستی کی ستائی ہوئی نہیں ہے"۔ مشتاق نے اپنے مطلب کی بات سن کر ایک حسرت خیز تبسم سے میری داد دی۔

رات کے ۹ بج چکے تھے بستر بچھایا گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اپنا بستر بچھایا ہے بھی نہیں تنہا مجھی کو دونوں بستر بچھانے پڑے۔ اس لئے کہ کبھی کبھی اسپر ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا تھا جیسے وہ دنیا کا کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے اپنی تمام کاہلی اور سستی برطرف کر کے چست و چالاک بن جانا پڑتا تھا۔ اب ہم تھے اور ایک بنگالی زلف کا طویل افسانہ۔

"ریاض تم دیکھنے میں سیدھے سادے مولوی نما مسلمان معلوم ہوتے ہو لیکن ہو بڑے کافر۔ آخر اس وقت مسز چیٹر جی کیوں سوجھ گئی۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہو" مشتاق نے کہا۔ حالانکہ اس کے لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ موسم نے اسپر اپنا کافی اثر کیا ہے اور وہ اس وقت خود پریشان ہونے کا آرزومند ہے۔ اس نے اپنی باریوں سلسلہ شروع کیا:۔

"یہ قصہ اُس وقت کا ہے جبکہ میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔ یہاں اس بات کو یاد رکھو کہ یہ زمانہ میری زندگی کا نہایت پرشور زمانہ تھا میری پراگندہ دلی کی کوئی انتہا نہ تھی میں بلاوجہ پریشان و منتشر مزاج رہا کرتا تھا۔ اور جہاں کہیں سکون کی موہوم سے موہوم امید ہوتی تھی میں وہاں اپنے دل کو لگانے کی کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ ان دنوں طرح طرح کی آلائشوں میں اپنے لطیف عناصر کو خراب کر رہا تھا۔ لیکن آہ سب بیکار ثابت ہوا۔

این بادہ خمار داشت ہشیار شدیم　　ایام شباب بود مستی کردیم

خیر اصل قصہ سنئے۔ تم مسٹر بنرجی کو جانتے ہوگے وہی جو الٰہ آباد میں میرے انگریزی کے پروفیسر تھے۔ مسز بنرجی کلکتہ یونیورسٹی کی بی اے آنرس تھیں جب کبھی مسٹر بنرجی کا دل کالج جانے کو نہ چاہتا تو اپنی بیوی کو بھیجدیتے۔ یعنی بیوی کے گریجویٹ ہونے سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے جب مسز بنرجی کلاس میں آتیں تو میری روح کو تکلیف ہوتی تھی۔ میری باغیانہ طبیعت اس منظر کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ مجھے اب محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ عورت اب عورت رہنا نہیں چاہتی۔ اور اپنی نسائیت سے برسرپیکار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کلاس میں مسز بنرجی سے غیر ضروری سوالات کرنے شروع کئے۔ جب وہ سقراط کے حالات پر لکچر دینے لگتیں تو میں خواہ مخواہ تنقید کرنے کھڑا ہو جاتا اور پے بہ پے سوالات سے ان کو پریشان کر دیتا مسز بنرجی میرے وسیع مطالعہ اور غائر نگاہ کی قائل ہو گئی تھیں لیکن آخر میری حیثیت کیا تھی؟ ایک معمولی طالبعلم کی۔ ان کو میری چھیڑ ناگوار ہوئی اور ایک دن کہنے لگیں "مسٹر مشتاق اگر واقعی تم اس سوال کو حل کرنا چاہتے ہو تو میرے بنگلہ پر آؤ اگر کالج میں مجھ سے پڑھنا منظور نہیں تو صاف صاف مجھ سے کہہ دو میں کلاس چھوڑ دوں

صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

وہ بھی نہایت شریف عورت۔ دل ہی دل میں میری ذہانت کی داد دیتی رہی تھی۔ ایک دفعہ میرا سہ ماہی یا ششماہی امتحان تھا ہماری کاپیاں مسز بنرجی کو دیکھنے کو ملیں۔ میری کاپی دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے مجھے بلا کر کہا "آج تک ایسی گہری تنقید اور ایسا دلکش اسلوب بیاں میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سے اکثر تبادلۂ خیالات کیا کروں جس سے ہم دونوں کو فائدہ ہوگا۔" دوسرے دن میں چار پر بلایا گیا یہیں سے مسز بنرجی سے بے تکلفی شروع ہوئی۔ تھوڑے عرصہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیچاری میری گرویدہ ہوگئی ہے اور اگر یہ کہوں کہ مسز بنرجی مجھے چاہنے لگی تھی تو غلط بیانی نہ ہوگی جب تک میں اس کے سامنے رہتا وہ میری صورت دیکھتی رہتی اور میری باتوں کو محویت کیساتھ سنتی رہتی حتیٰ کہ اس نے مجھ سے کہدیا "تم میں نہ جانے وہ کونسی کشش ہے جسنے مجھے مبہوت کر لیا ہے اور اب میں اپنے اندر تمھارے لئے ایک تمنا ایک حسرت۔ ایک تڑپ پاتی ہوں اب شاید تمھاری صحبت کے بغیر مجھے کسی بات میں دلچسپی نہ ہو" جو کچھ اُس نے کہا اُس کی آنکھوں نے اسکی تائید کی میں نے بیدلی اور بے نیازی کے ساتھ سب کچھ دیکھا اور سنا۔ اور ایک غیر ذمہ دارانہ تبسم کے ساتھ جواب دیا "تو کیا سچ ہے؟" اس کے بعد میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔"

پیالی کی چار ختم ہو چکی تھی میں نے بات کاٹ کر مشتاق سے کہا "اچھا لاؤ اور چار ڈھال دو" مشتاق نے پیالی مجھے دیدی اور ایک لمبی سانس لے کر چند منٹ چپ رہا۔ چار کا دوسرا دور شروع ہوا اس نے پھر کہنا شروع کیا "ہاں تو اول اول مسز چٹرجی سے مجھ سے مسز بنرجی کے کمرہ میں ملاقات ہوئی مسز بنرجی کا بنگلہ بھی پاس تھا اور وہ اکثر مسز بنرجی کے ہاں آیا کرتی تھی۔ ایک روز چار پر وہ بھی موجود تھی اور مختلف مسئلوں پر بحث ہو رہی تھی۔ اسی سلسلہ میں یونان کی مشہور شاعرہ صافو کا ذکر آیا۔ مسز بنرجی پر صافو کی داستان محبت نے بڑا اثر کیا تھا۔ اُس نے بات ہی بات میں فلسفۂ محبت پر بحث چھیڑ دی۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کے پیدا کرنے کی صرف اس لئے ضرورت پڑی کہ کائنات کی کوئی دوسری چیز محبت جیسی امانت کی حامل نہ ہو سکتی تھی۔ وہ حافظ کے اس فلسفہ کی پیرو تھی ؎

جلوۂ کرد رخش دید ملک عشق نداشت   عین آتش شد ازین غیرت و بر آدم زد

جب مجھ سے میری رائے پوچھی گئی تو میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ آج تک میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ محبت ہے کیا بلا اور کب اور کیوں رونما ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ محبت کا واقعی کوئی وجود ہو یا نہ ہو میرے خیال میں یہ امر مسلمہ ہے کہ ننانوے فیصدی محبت کرنے والوں کو محبت نہیں بلکہ ایک غلط فہمی ہوتی ہے۔ جس کو وہ اور دنیا والے خواہ مخواہ محبت سے تعبیر کر لیتے ہیں۔" میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن مسز چٹرجی کے دل میں ایک شورش برپا ہوگئی۔ مجھ سے اس سے اب تک کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ میں خدا جانے کیوں اُس کی نگاہوں سے پہلو بچا رہا تھا مگر اب اس نے مجھے مخاطب کیا اور صرف اتنا پوچھا "کیا سچ ہے اب تک آپ نہیں جانتے محبت کیا چیز ہے"۔ میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی کے ساتھ مسز چٹرجی نے مجھے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں نے سر جھکا لیا۔ میرے اعصاب میں رعشہ پیدا ہو گیا اور پیالی میرے ہاتھ چھوٹ کر چور چور ہو گئی۔ مسز بنرجی نے مجھے دیکھا اور اپنی حیرت کو مسکراہٹ سے چھپا لیا۔ میں نادم ہو کر رہ گیا۔ شگون کچھ اچھا نہ تھا میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہوا تقریباً پندرہ منٹ بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا قریب قریب روز شام کو مسز بنرجی سے ملنے جایا کرتا تھا۔

ہر قسم روغن اصغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ سے خرید کرنا چاہیے

اب مجھے ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ کہیں مسز چیٹرجی نہ آجائے۔ میں اس عورت سے کیوں گھبراتا تھا مجھے نہیں معلوم اس کی آنکھیں۔ اس کے تیور اس کے سب کچھ اُف نہ جانے کیا تھے! اتفاق دیکھئے اس روز کے بعد مسز چیٹرجی مسز بینرجی کے مکان پر بلاناغہ آنے لگی۔ اس درمیان میں مجھ سے اس سے کچھ زیادہ گفتگو نہ ہوئی تھی وہ اپنے دو خوبصورت چھوٹے بچوں کیساتھ مشغول رہا کرتی تھی۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ وہ مجھ سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہے۔ اس کی بیگانگی اس کے قلبی لگاؤ کا راز فاش کر رہی تھی مسز بینرجی اُس سے بہت بچ بچ کر بات کرتی تھی۔ اس لئے کہ مسز چیٹرجی اسکو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ اسکو اپنے ذی اولاد ہونے پر غرور تھا اور مسز بینرجی غریب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ عورت کا بے اولاد ہونا اس کی زندگی کو کہاں تک بدمزہ بنا سکتا ہے۔ مسز بینرجی سمجھی تھی کہ مسز چیٹرجی کو اپنے تفوق پر ناز کرنے کا حق حاصل ہے وہ مسز چیٹرجی سے ہر حالت میں زیادہ حسین و جمیل کہے جانے کی مستحق تھی۔ لیکن قوت ارادی کی کمی اور اعلیٰ تعلیم نے اس کی نسائیت کو مسز چیٹرجی کے مقابلہ میں کمزور کر دیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مسز بینرجی کے ہاں مسٹر چیٹرجی اور چند دوسرے پروفیسر جمع تھے میں بھی موجود تھا اور مسز چیٹرجی بھی۔ ہر پروفیسر اپنے اپنے رنگ کی بات کر رہا تھا مسٹر چیٹرجی نے حروب صلیبی کا قصہ چھیڑ دیا مجھے ان کی رائے سے اختلاف تھا۔ وہ کسی طرح میری رائے کو تسلیم نہ کرتے تھے میں نے مغربی مورخین کو اتنے حوالے دے کہ اُن کو چکر آگیا اور وہ میرا منہ تکنے لگے جب مجمع برخاست ہونے لگا تو انھوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوے کہا۔

اچھا اب کی اتوار کو میرے مکان پر آؤ تو ہم آج کی بحث کا فیصلہ کریں" میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مسز چیٹرجی بول اٹھی" ہاں ہاں ضرور آئیے۔ آپ بڑی دلچسپ چیز ہیں اور آپ کی صحبت میں انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آپکے آنے سے مجھے بڑی مسرت ہوگی میں نے آہستہ سے آنے کا وعدہ کر لیا اس پر مسز چیٹرجی کی ذرا شرارت دیکھنا مسز بینرجی سے کہنے لگی وہ کیوں تمھیں کچھ ناگوار تو نہ ہوگا؟" مسز بینرجی کی پیشانی نم آلود ہوگئی اور اس نے نیچی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ گویا مطلب یہ تھا کہ میں نہ صرف تمھارے لئے خفیف کی گئی بلکہ آج سے تم کو کھو رہی ہوں

مشتاق اتنا کہکر رک گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر ایک مجھے دیا اور ایک خود پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ پھر جاری کیا۔

"ریاض تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ان دنوں کس دور انتشار سے گزر رہا تھا۔ اسی اتوار کی شام کو میرا نکاح ہونے والا تھا۔ میرے پانوں میں زبردستی زنجیریں ڈالی جا رہی تھیں۔ خود میری زندگی مجھے وبال ہو رہی تھی۔ اس پر نئی مصیبت یہ کہ ایک معصوم عورت کی زندگی مجھ ناکارہ سے وابستہ کرکے خراب کیجا رہی تھی۔ یہ والدین کی وہ غلطی ہے جسے خدا معاف کرے تو کرے میں نہیں کرتا اور پھر خدا کو معاف کرنے کا حق ہی کیا حاصل ہے؟ بہرحال میری عجیب کیفیت تھی۔ میرے اضطراب کا اس وقت تک کوئی علاج نہ ہو سکا تھا میں نے مختلف دلچسپیوں میں اپنا جی بہلانا چاہا۔ لیکن سب بے سود ہاں تو وہ میرے نکاح کا دن تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا میں ایک نئی زندگی سے گھبرا رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے میں نے قریب قریب سارا دن مسٹر چیٹرجی کے ہاں صرف کر ڈالا ہر طرف میری تلاش ہو رہی تھی اور یہاں مسز چیٹرجی کی دلربائیاں اپنا جادو چلا رہی تھیں میں مسٹر چیٹرجی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا اور مسز چیٹرجی بہانہ ڈھونڈھ ڈھونڈھکر مجھے اپنی طرف مخاطب کر رہی تھی میں عجیب عالم میں تھا۔ ایک طرف تو اس عورت سے

بڑھیا عطر صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

خائف تھا۔ دوسری طرف اس کی دلنشین ادائیں میری رگ رگ میں اپنا اثر پھیلا رہی تھیں شام کو کوئی تین بجے میں اس کے پاس سے اٹھا اور گھر واپس ہو کر ایک معصوم عورت کے ساتھ زبردستی پیمانِ رفاقت باندھ لیا اس کے بعد میں ایک عرصہ تک مسز چیٹرجی سے نہیں ملا البتہ مسز بنرجی سے ملتا رہا وہ مضمحل رہنے لگی تھی اس میں وہ تپاک نہ تھا میں اس تغیر کا سبب جانتا تھا لیکن اس سے کچھ پوچھ نہ سکتا تھا۔ ایک دن میں کتابیں لئے کالج جا رہا تھا۔ راستہ میں مسٹر چیٹرجی کا بنگلہ پڑتا تھا۔ مجھے آدھا گھنٹہ دیر ہو چکی تھی اور اس لئے جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک میرا نام لے کر کسی نے مجھے مخاطب کیا۔ مڑ کر جو دیکھا تو مسز چیٹرجی برآمدہ سے مجھے بلا رہی تھی۔ ریاض میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس عورت میں کچھ غیر معمولی قوتیں ہیں جن کے سامنے انسان اپنی تاب مقاومت قائم نہیں رکھ سکتا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے میں اس سے ملنے گیا۔

اس نے بلا کسی تمہید کے ایک حاکمانہ لہجہ میں کہا "آج کالج نہ جاؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے جو تمھاری وسیع معلومات میں ایک بیش بہا اضافہ کردیگی"۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی میں گھبرایا میری گھبراہٹ میرے چہرہ سے ظاہر ہونے لگی۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں خاموش کھڑا تھا اور وہ میرے بشرہ کا مطالعہ کر رہی تھی دو تین منٹ اس طرح گزرے ہوں گے کہ اس نے پھر مجھ سے اس طرح کہا۔ سوچتے کیا ہو بیٹھ جاؤ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر ایک دن کالج نہ جاؤ گے تو کچھ بڑا نقصان نہ ہو جائیگا"۔ میں چپ رہا اور کتابیں ایک طرف میز پر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے وہ بھی بیٹھ گئی کچھ دیر تک پتھر کی دو مورتوں کا مقابلہ تھا۔ آخرکار اس کے ہونٹ ہلے اور ایک مرعوب کرنے والے لہجہ میں اس نے کہا میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں اگر تم اس کو سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہو یعنی اگر بلا سوچے سمجھے کوئی رائے نہ قائم کرلو"۔ میں نے عاجز ہو کر اور اپنے دل کو مضبوط کر کے جواب دیا "کہہ بھی ڈالئے"۔

"آخر تمھارے اعصاب ایسے کھنچے ہوئے کیوں ہیں؟۔ تمھاری رگوں میں اس قدر ضرورت سے زیادہ تناؤ کہاں سے آیا؟ تم جیسے سخت دل اور بے حوصلہ آدمی سے اپنی بات اس وقت تک نہ کہوں گی جب تک کہ تم سے پوری ہمدردی کا وعدہ نہ لے لوں"۔ میری سراسیمگی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جاتی تھی میں نے آنکھیں اٹھا کر مسز چیٹرجی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی جادو نگاہی کا مقابلہ میں نہیں کر سکتا۔ وہ آنکھیں! اُف!....... میں ان کا سامنا کر کے کانپ گیا اور یہ کہتے ہی بن پڑا "کہئے میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے"۔ اس نے کرسی قریب کھینچ کر کسی قدر دبی زبان سے کہا "مشتاق مجھے معاف کرو میں تم کو بُری طرح چاہتی ہوں......"

یہ جملہ سنتے ہی میں چونک پڑا اور پھر سر جھکا لیا اس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "تم مجھکو کوئی آبرو باختہ بے حیا یا گری ہوئی عورت نہ سمجھنا زندگی میں چند لمحے ہوتے ہیں جنسے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں جب میں نے پہلی بار تم کو مسز بنرجی کے ہاں دیکھا اسی وقت تم میں ایک کشش محسوس کی اور تمھاری وہ محبت پر بحث سن کر تمھاری طرف اور بھی کھنچی تمھاری بے نیازی بے حوصلگی تمھاری بے پروائی نے میرے دل میں ایک تمنا پیدا کر دی جسکو میں نے بہت چاہا مگر مٹا نہ سکی آج اسی تمنا کو تم اس صورت میں دیکھ رہے ہو" یہ کہکر اس نے اپنے دعویٰ محبت کے بلند آہنگی پر میرا بوسہ لے کر مہر ثبت کر دی۔ ریاض پھر نہ پوچھو کیا ہوا۔

وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور جس سے میں بچ رہا تھا......"

میں بول اٹھا "تو یوں کہو کہ وہ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا"۔ مشتاق

دنیا بھر میں مشہور ہے کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ ہے

نے کہا۔ "نہیں نہیں، ریاض وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس دنیا میں وہ ہو ہی نہیں سکتا جو نہ ہونا چاہیئے۔ اب اپنے دل کی حالت کیا بیان کروں وہ احساس گناہ تھا یا کیا جس نے میرے اندر ایک ہلچل مچا رکھی تھی۔ احساس گناہ کیونکر کہوں؟ اگر گناہ اسی کو کہتے ہیں تو میں اس سے پیشتر ایسی صدہا گناہوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اصلیت یہ ہے کہ یہ میری پہلی شکست تھی اور وہ بھی ایک عورت کے ہاتھوں جو میرے دل میں کھٹک پیدا کر رہی تھی۔ میں جو ایک عورت کو مرد کی معلم دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا آج اس عورت کے بس میں کیونکر آ گیا۔ اس کے بعد مدتوں میرا یہ حال تھا کہ بلا ارادہ میرے قدم مسز چیٹرجی سے ملنے کے لئے اٹھ جاتے اور میں وہاں جاکر زندگی کی اہم تر ذمہ داریوں کو بھول جاتا۔ میں ہوش میں تھا مجھ پر ایک گھرا نشہ چھا گیا تھا جو عرصہ تک قائم رہا۔ ایک دن میں نے سنجیدگی کے ساتھ مسز چیٹرجی سے کہا "تم نے یہ سب کچھ تو کیا۔ لیکن اس کا خیال نہ ہوا کہ ہم اپنے پیمان محبت کو نباہ بھی سکتے ہیں یا نہیں آخر اس طرح کب تک بسر ہوگی؟ فرض کرو کہ میں نے تم سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو تم کیا کرو گی؟ میں دنیا میں آج تک کبھی کسی کا پابند نہیں رہا خواہ مخواہ تم مجھے پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں الہ آباد میں ہمیشہ رہ سکتا ہوں نہ تم۔" وہ کچھ دیر کے لئے افسردہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی مگر پھر میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی۔ "نہیں اب تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے میں نے تم کو محبت کی لذت سے آشنا کر دیا ہے۔ تم نہیں جانتے تھے کہ محبت کیا چیز ہے میں نے تمکو بتا دیا میں تمھاری محسن ہوں تم مجھ پر ظلم نہ کرو گے۔" اف وہ کیسے دھوکے میں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اب تک نہیں جانتا کہ محبت کس عنقا کا نام ہے لیکن مسز چیٹرجی کے لب و لہجہ میں کچھ زور ایسا تھا کہ میں اس کا دھوکہ رفع کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ سال بھر اسی طرح گزر گئے آخرکار مجھے ہوش آیا اور اپنی ذات سے شرم معلوم ہونے لگی۔ میں نے بتدریج مسز چیٹرجی سے ملنا کم کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں میں مجھے الہ آباد چھوڑ دینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ میں نے سمجھا کہ بڑی آفت سے نجات ملی لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہاں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس درمیان میں میں نے مسز چیٹرجی سے ملنا یک قلم ترک کر دیا تھا۔ مجھے ان سے ندامت معلوم ہوتی تھی اور میں اپنے کو ان کا گنہگار سمجھنے لگا تھا!"

رات ختم ہو گئی تھی صبح کا تارہ نکل آیا تھا مشتاق نے اپنی داستان کو نامکمل چھوڑ دیا اور ہم لوگوں نے دہلی کے لئے سامان سفر درست کیا۔

(۴)

دہلی میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم بھاڑ جھونکتے رہے۔ لیکن خاک ضرور چھانتے رہے۔ "کارونیشن ہوٹل" میں ہمارا قیام تھا دو تین روز تک ہم کچھ ایسے ضروری کاموں میں مصروف تھے کہ نہ تو مشتاق کو مسز چیٹرجی کا ذکر چھیڑنے کی فرصت ملی اور نہ مجھے اتنا یاد رہا کہ اس سے فرمائش کر کے کچھ اور حالات سنتا۔ ایک دن ہم جامع مسجد سے چاندنی چوک جا رہے تھے راستہ میں ایک تانگہ پر باجا بجتا ہوا جا رہا تھا جس کی بھدی اور کریہ آواز اعلان کر رہی تھی کہ کسی تھیٹر یا سینما کا اشتہار تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک اشتہار میرے ہاتھ میں بھی دیدیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لینے میں میرے ارادہ کو کتنا دخل تھا۔ بہر حال میرے ہاتھ میں اشتہار تھا: "مدن پکچر پیلس میں آج "سالومی" کا مشہور و معروف کھیل دکھایا جائیگا...." اور خدا جانے کیا کیا اشتہار میں درج تھا۔ ہمارا جیب خرچ سرعت کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ مشتاق کو اپنی چائے اور سگریٹ میں کمی کرنی پڑی اور میں نے تو سگریٹ پینا چھوڑ ہی دیا تھا۔ لیکن مشتاق نے کہا "چاہے آگرہ بلا ٹکٹ ہی جانا پڑے مگر سینما ضرور دیکھا جائیگا"۔ میں نے کہا

اعلیٰ درجے کا عطر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے۔

"رجی نہیں یہ نہیں ہوگا" "یہ نہیں یہی ہوگا" مشتاق نے پر زور لہجہ میں کہا - آخر وہی ہوا جو اس نے کہا - اور ہم پونے نو بجے کھیل کی دوسری نمائش کیوقت بکچر پیلس میں موجود تھے - نمائش شروع ہوئی - میرے لئے ان تصویروں میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی - میں اس ڈرامہ کو پڑھ بھی چکا تھا - اور اب قصہ کی حیثیت سے بھی میں اس میں کوئی نئی لذت نہ پاتا تھا - جب تک تماشا ختم نہ ہوا میں نہایت غور سے مشتاق کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا جو بجائے خود متلون اور متضاد جذبات کا محل نمائش ہو رہا تھا - آج میں نے دیکھا کہ مشتاق کی پھر وہی حالت ہے جو اس روز تھی جبکہ وہ بیساختہ " اس کا کیا علاج " کہہ اُٹھا تھا - پردہ پردہ وقت بھی قیامت کا تھا جب سالومی یوحنا سے کہتی ہے کہ "میں تمھارا بوسہ لے کر رہوں گی" معلوم ہوتا تھا کہ مشتاق بیہوش ہو جائے گا - اور وہ بیہوش ہو جاتا اگر نمائش اسیوقت بند ہو جاتی - لیکن چونکہ متحرک تصویریں پے بہ پے آجا رہی تھیں اور اس کی توجہ کو اپنا بنائے ہوئے تھیں - اسلئے اسکو بیہوش ہونے کا موقع نہ ملا کھیل اختتام کو پہونچ رہا تھا - ایک تصویر سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - اب بھی جب کبھی عالم خیال میرے سامنے وہ منظر آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - سالومی اپنے ہنگامہ جذبات سے مجبور ہو کر یوحنا کا سر کٹوا لیتی ہے اور ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس کے بیجان رخساروں کو چومنے لگتی ہے - عورت بھی کائنات کا ایک معمہ ہے - وہ اپنے جذبات کے سامنے دنیا کو دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیوں کو ہیچ سمجھتی ہے - محبت میں وہ اس طرح بھی محو ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ اور مردہ چیزوں میں کوئی امتیاز نہ کر پائے - سالومی بھی اسی قماش کی عورت تھی - اسکو کائنات میں یوحنا ہی یوحنا نظر آرہا تھا وہ یوحنا کی دُھن میں اپنے گرد و پیش سے اس طرح بے خبر تھی کہ اُس کے چاہنے والے نوجوان شامی نے انتہائے رشک سے مغلوب ہو کر اس کے سامنے خودکشی کرلی اور سالومی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں - عورت اپنے محبوب کا خون بھی کر سکتی ہے - اگر اس طرح اس کے خروش محبت کو آسودگی اور سکون نصیب ہو جائے میرے تاثرات کی کوئی حد نہ تھی - مشتاق کا حال ناقابل بیان تھا - ہم کس عالم میں اپنے قیام گاہ تک پہونچے ہم کو کچھ خبر نہیں آج مشتاق پھر خاموش تھا - معلوم ہوتا تھا کہ کھیل نے اس کو کسی دوسری دنیا میں پہونچا دیا ہے - سوچتے سوچتے وہ اٹھا اور برقی چولھا جلا کر چاء بنانے لگا میں سمجھ گیا کہ آج کی رات یوں ہی گئی - مشتاق کی نیت سونے کی نہ تھی - میں منتظر ہی تھا کہ دیکھئے اب کون سا پہلو بدلتے ہیں کہ اتنے میں اس کی زبان سے نہایت دردناک آواز میں یہ مصرع نکل گیا -

کیا شہید بھی قاتل نے خون بہا بھی دیا

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ سالومی ابھی تک حضرت پر مسلط ہے - چند منٹ بعد اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر کہا " نہ جانے مسز چٹرجی کا کیا حال ہے؟ میں سمجھ گیا - لیکن پھر بھی اس سے پوچھا " آخر یہ بے وقت مسز چٹرجی کی یاد کیوں آگئی؟ " اس نے جواب دیا " نہ جانے سالومی اور مسز چٹرجی میں کون سی چیز مشترک ہے کہ میں اسوقت دہلی میں ہوں اور میرا خیال الہ آباد میں - یقین مانو جسوقت مسز چٹرجی نے میرا بوسہ لیا ہے اس کی ہئیت بالکل سالومی کی سی تھی - اور میں گلو بریدہ یوحنا سے کسی طرح کم نہ تھا جہاں تک مجبوری اور فقدان ارادہ کا تعلق ہے اسوقت ساری کائنات میرے خلاف صف آرا تھی اور مجھے شکست دینے پر تلی ہوئی تھی - آہ! مجھ سے کوئی پوچھے کہ انسان فطرت کے ہاتھوں کتنا مجبور ہے مسز چٹرجی کا یہ جملہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ " بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جنمیں انسان مجبور ہوتا ہے " جو واقعات میں تم سے بیان

اصغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ سے عطر منگائیے

کرچکا ہوں ان میں میرے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا

جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں میری تمام سرگزشت سننے کا اشتیاق ہے بہتر ہے آج کی رات بہرحال آنکھوں میں کٹے گی خیر یوں سہی۔ جب میں نے مسز چیٹرجی سے ملنا ترک کیا تو اس کے متعدد شکایت نامے آئے ان میں سے بعض نہایت پر اثر اور دل ہلا دینے والے تھے۔ لیکن اب میں ہوش میں آچکا تھا۔ اپنے خواب سے بیدار ہو چکا تھا وہ جو ایک وقتی اثر میری رگ رگ پر طاری ہو گیا تھا فنا ہو چکا تھا۔ اور اب میں خواہ مخواہ اپنی ایک لغزش۔ اپنی ایک غلطی کو نباہنا نہیں چاہتا تھا جب میں نے الہ آباد چھوڑ دیا تو شروع شروع کچھ دنوں تک مسز چیٹرجی کو نہ جانے کس طرح میرا پتہ معلوم رہا۔ چنانچہ اس نے تین چار خطوط بھیجے اور میرے رہے سہے سکون میں خلل ڈالتی رہی۔ آخر کار میں نے اس کی باضابطہ کوشش کی کہ اسکو میرا پتہ معلوم نہ ہو سکے۔ چند خط میرے ٹرنک میں موجود ہیں تم ان کو دیکھ سکتے ہو"۔

یہ کہکر مشتاق نے اپنے ٹرنک سے وہ تحریریں نکالیں جن کے لکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ دل کا ایک ایک قطرۂ خوں صرف کیا گیا ہے۔ ایک خط میں لکھا تھا "یہ بے اعتنائی میرے کس جرم کی سزا ہے۔ میں نے اگر کسیکو نقصان پہونچایا ہے۔ کسی کو تباہ کیا ہے یا کسی کو خاک بسر کیا ہے تو اپنی ذات کو۔ تم کو نہیں۔ پھر یہ کشیدگی کیوں؟ یہ عتاب کس لئے؟ یہ دل آزاری کیسی؟ میرے مشتاق کچھ جواب دو!"۔ دوسرے میں نے لکھا تھا "مشتاق! پیارے مشتاق! تم کو کچھ احساس نہیں تمھارا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ تم نہیں سمجھتے کہ میں ساری دنیا سے منہ موڑ سکتی ہوں جوگ لے سکتی ہوں۔ تیاگی بن سکتی ہوں۔ مگر تم کو آہ! تم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ مشتاق میری بات سنو سمجھو اور مجھ پر رحم کرو۔ تیسرے میں لکھا تھا "ظالم میری بددعا کیوں لیتا ہے۔ دکھے ہوئے دل کے کوسنے خالی نہیں جاتے"!

میں تحریریں نہ دیکھ سکا۔ میرے دل میں تاب نہ تھی جو عورت محبت میں بددعائیں دے سکے۔ اسکی بیزاری اور دلبستگی کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہوگا۔ مشتاق اپنے ہیجان کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ میں اسکی حالت پر غور کر رہا تھا۔ یکایک اس نے شاید خود اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہا "کچھ نہیں ہونے والی بات تھی"

اب میں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لینا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا عجیب ناعاقبت اندیش عورت ہے۔ دنیا کی رسمی پابندیوں اور معاشرتی مجبوریوں کو نہیں سمجھتی۔ خواہ مخواہ تم سے امیدیں لگائے ہوئے ہے تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ مشتاق نے بیتاب ہو کر جواب دیا "ریاض تم کچھ نہیں سمجھتے میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں ورنہ جن پابندیوں اور مجبوریوں کا تم ذکر کرتے ہو وہ نہ میرے لئے کوئی معنی رکھتیں اور نہ اس کے لئے میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ مشتاق کی بے چینی بڑھ رہی تھی وہ ایک خاص کشمکش میں پڑا تھا۔ اس وقت اس کے قیافہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہا ہے اور مسز چیٹرجی سے تغافل برتنے پر پشیمان ہے اس کی یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی اس نے اپنے تیور درست کرکے کہنا شروع کیا۔ میں الہ آباد سے دور رہ کر یہ سمجھتا تھا کہ اب میں بالکل محفوظ ہوں اور اب مسز چیٹرجی شاید مجھ پر قابو نہ پا سکے گی۔ میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا ایک دفعہ مجھے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکو میری آمد کی خبر ہو گئی۔ الہ آباد پہونچنے پر دوسرے ہی دن شام کو اس کا ایک رقعہ آیا جسمیں لکھا ہوا تھا "مجھ سے آکر مل جاؤ ورنہ میں خود تم سے ملنے آتی ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں گیا۔ پھر کیا بتاؤں کیا ہوا وہ کچلے ہوئے سانپ

خوشبو کا بہترین کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ ہے۔

کی طرح مجھ پر چوٹ پر چوٹ کر رہی تھی۔ کبھی روتی تھی اور کبھی کھا جانیوالی آنکھوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ کبھی مجھ سے رحم و تلطف کی التجا کرتی تھی اور کبھی حاکمانہ انداز میں مجھ سے جواب طلب کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا "کیوں مشتاق میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس طرح مجھے مٹانے کے درپے ہو گئے ہو؟" میں نے دبی ہوئی زبان سے کہا "ابتدا تمھیں نے کی تھی" وہ بولی "یہ صحیح ہے لیکن تم تو شکست کا اعتراف کر چکے تھے۔ اب اس سرتابی اس رو گردانی کے کیا معنی؟" پھر میں کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں اس کی جلتی ہوئی زبان کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ وہ پھر کہنے لگی "بتاؤ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جس سے التجا کر کے جس کے قدموں کو چوم کر تمھاری توجہ کو اپنی طرف منعطف کر سکوں یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھ سے بے نیاز ہو کر رہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک عورت تمھارا دم بھرتی ہو۔ تمھارے لئے برباد ہوتی ہو اور تم اس سے مستغنی ہو کر چین سے زندگی بسر کرو۔ وہ عورت جس نے اپنی عزیز ترین چیز تم پر نچھاور کر دی ہو کیونکر گوارا کر سکتی ہے کہ تم اُسے بھول جاؤ؟" اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہی ہے اس سے زیادہ کر کے دکھا سکتی ہے۔ مبالغہ نہ سمجھو ارادہ کو عمل میں لانے کی قوت اسمیں ساوتری سے کم نہیں۔ ایسی عورت کا کیا علاج اور پھر اس کا کیا علاج کہ میں کسی طرح محبت کے مغلوب کرنیوالے جذبات اپنے اندر نہیں پاتا جو دین و دنیا سے بے خبر ہو کر میں اس عورت کا ہو جاؤں۔

جسوقت میں مسز چیٹرجی کے بنگلہ سے نکلا ہوں سامنے مسز بینرجی اپنے بنگلہ کے برآمدہ میں کسی خیال میں محو کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اب میں بغیر اس سے ملے نہیں جا سکتا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے محبت اور حسرت بھرے لہجہ سے کہا "مسٹر مشتاق بہت دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی ایسے وقت کہ دو ایک گھنٹوں میں الہ آباد کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے والی ہوں۔ خیر" اسکی آواز دردمند تھی میں جواب نہ دے سکا وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی گویا میری پیشانی پر میری سرگزشت لکھی ہوئی تھی جسے پڑھکر اس نے کہا۔ مسٹر مشتاق ہم آپ سب اتفاقات کے ہاتھوں مجبور ہیں مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ جو ہونے والا تھا وہ ہوا اس میں نہ آپ کی کوئی خطا ہے نہ میری اور نہ مسز چیٹرجی کی۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ آپ مجھ سے چھن جائیں اور مسز چیٹرجی کی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب آپ محبت کی چیز نہ رہے پھر بھی میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھونگی" میں یہ سنکر پانی پانی ہو گیا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مسٹر بینرجی الہ آباد چھوڑ کر میرٹھ کالج جا رہے ہیں میری مسلسل خاموشی سے نہ جانے وہ کیا سمجھی اور کہا۔ "اچھا تو الوداع" اور ہاتھ ملا کر کمرہ میں چلی گئی میں سیدھا اپنے گھر آیا مسز چیٹرجی کی ملاقات نے از سر نو مجھے ایسا پریشان کیا تھا کہ دوسرے ہی دن میں الہ آباد سے بھاگ کھڑا ہوا اور مدتوں اسکو بھولا رہا۔ اس دوران میں اس کی جو حالت بھی رہی ہو مجھے کوئی صحیح علم نہیں۔ اب کی بار اپنی بدنصیبی سے الہ آباد پھر جانا پڑا اس دفعہ تم بھی موجود تھے میں نے لاکھ چاہا کہ مسز چیٹرجی کو میرے الہ آباد پہونچنے کا علم نہ ہو مگر وہ جان گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم سے کہہ چکا ہوں۔ اب کی دفعہ میں زیادہ پریشان اس لئے ہوں کہ وہ کہہ چکی ہے "مشتاق تم جہاں رہو زندگی میں جو دلچسپیاں چاہو پیدا کرو مگر یہ یاد رہے کہ میں زیادہ عرصہ تک اس طرح رہ سکتی ہوں اور نہ تم" ریاض اس جملہ کے سیکڑوں معنی ہوتے ہیں نہ جانے کیا کیا وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ خدا ہم دونوں کی مدد کرے"

عطر موتیا بہترین عطر ہے صغیر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

مشتاق کا افسانہ ختم ہوگیا وہ بیچین تھا۔ میں خاموش۔ رات بھر ختم ہوگئی تھی۔ مکان اور ماندگی سے مجبور ہو کر صبح کے وقت دونوں کی آنکھیں لگ گئیں۔"

(۵)

تقریباً دو برس میں مشتاق سے سینکڑوں میل دور رہا۔ جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے تو آپس میں خط و کتابت کے بڑے بڑے وعدہ ہوئے تھے لیکن انکو وفا کون کرتا ہے۔ ایک مدت تک میں مشتاق کی زندگی کے حالات سے بالکل بے خبر رہا۔ ایکدن خلاف امید اسکی ایک مختصر تحریر مجھکو ملی جسمیں اصرار کیساتھ مجھکو بلایا گیا تھا میں گیا جو کچھ کہ میری آنکھوں نے دیکھا اس کا کبھی خواب میں بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ مشتاق دنیا کے ہر کار و بار سے سیر ہو کر گوشہ نشین ہو گیا تھا اور سادہ ترین زندگی بسر کر رہا تھا جو کچھ واقعات اس کی زبانی مجھے معلوم ہوئے وہ یہ ہیں مشتاق گزشتہ دو سال سیاسی ہنگاموں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ پڑا رہا اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ اس سے بھی اسکو آسودگی میسر نہ ہوئی اور اب تو اس کا خیال ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی سب سے زیادہ لغو اور بے معنی زندگی ہے وہ کہتا ہے "اگر خدا عرش سے اتر کر آئے اور مجھ سے کہے کہ تمھاری ایک انگلی کی جنبش سے ہندوستان میں سوراج ہو جائیگا تو میں اس انگلی کو ہرگز جنبش نہ دونگا۔"

وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر الہ آباد چلا آیا تھا اور ایک گوشہ میں بیٹھکر مطالعہ اور مراقبہ میں زندگی کے باقیماندہ دن گزار دینا چاہتا تھا مسز چٹرجی نے پھر اس کو چین نہ لینے دیا۔ مگر مشتاق کی دنیا بدل چکی تھی اُس کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا تھا اس کو اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے مسز چٹرجی سے ایک بار صاف صاف جاکر کہدیا "آپ بیکار اپنے کو سکون سے محروم نہ کیجئے مجھ کو آپ کی کوئی امید پوری نہیں ہو سکتی میں دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ پھر کوئی میری محبت کیوں کرے؟" اس کے چند ماہ بعد مسز چٹرجی کے دماغ میں فتور کے آثار نمایاں ہونے لگے اور جب میں الہ آباد پہونچا ہوں تو وہ پوری پاگل ہو چکی تھی قصے عجیب غریب ہوا کرتے ہیں مگر واقعات ان سے بھی زیادہ محیر العقول ہو سکتے ہیں۔ ہمارے خیالات کی انتہائی پرواز جہاں ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اکثر سنگین اور تلخ واقعات کی ابتدا ہوتی ہے مسز چٹرجی کی سی عورت جو دنیا میں حرف مٹانے آئی ہو۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے خود مٹ رہی ہے وہ اپنے جنون میں مشتاق کو "غارت گری کا دیوتا" کے لقب سے سب کے سامنے پکارتی ہے۔ مگر مشتاق اب اس دور سے گزر چکا ہے جسمیں انسان کو رسوائی اور بدنامی کا ڈر ہوا کرتا ہے وہ نہ اب مسز چٹرجی سے خائف ہے اور نہ اسکو کوئی غم ہے۔ سارے شہر میں مشتاق اور مسز چٹرجی کا قصہ مشہور ہو رہا ہے اس کو اس کی بھی پروا نہیں ہے وہ اس دنیا کو چھوڑ چکا ہے اور نہ جانے کس دنیا میں رہتا ہے۔ صرف دل بہلانے کی غرض سے اس نے شاعری شروع کر دی ہے اور بیگانہ تخلص کرتا ہے اسپر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ زندگی میں سکون کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسا لڑکوں کا چاند کے لئے بیتاب ہونا۔ مجھ کو تو اسکی زندگی "ناشاد و نامراد زیستن" کی بہترین مثال معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم اصلیت کیا ہے اس کا ایک شعر سننے کے قابل ہے جو بہت کافی حد تک اس کے معتقدات پر روشنی ڈالتا ہے۔

او دل راحت طلب اے عاقبت ناآشنا — کہتے ہیں راحت جسے وہ موت کا پیغام ہے

امتیاز احمد (بی اے)

بہترین اور تازہ عرق صغیر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

مثنوی اور سودا

شعرائے اردو نے غزل کے ساتھ مثنوی پر بھی توجہ کی ہے، بلکہ بعض شعرائے اسی سے ابتدا کی اور بعض محض مثنوی کی وجہ سے مشہور ہوئے مثلاً میر حسن نے "بدر منیر" اور نسیم نے "گلزار نسیم" لکھکر بقائے دوام پائی دکھنی شعراء نے خصوصاً اس طرف زیادہ توجہ کی اور مشہور فارسی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور اکثر نئے نئے واقعات نظم کر ڈالے۔

میر حسن نے اپنی طویل مثنوی ہیں اصناف مثنوی کو نہیں چھوڑا مگر اخلاقی پہلو نہ نباہ سکے، بخلاف ان کے میر تقی میر نے گو چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں مگر دامن اخلاق ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ اسیطرح میرزا رفیع سودا نے بھی پچیس چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی ہیں جنہیں بکمال متانت دامن اخلاق سنبھالا ہے ان میں دو تین خار بھی ملتے ہیں جو چشم اخلاق میں بری طرح کھٹکتے ہیں مگر یہ اور چیز ہے وہ ہجو کے بادشاہ تھے اور اپنے وقت کے عبید زکانی، اس سے قطع نظر کر لی جائے تو ان کانٹوں میں اکثر خوش رنگ اور خوشبودار پھول شام دماغ معطر کر دیتے ہیں اور گلچین ان خاروں کی خراش کو یک لخت بھول جاتا ہے۔

سودا کی کل مثنویاں جو اب تک مل سکیں حسب ذیل ہیں،

۱	مثنوی، قصہ پسر شیشہ گر		۱۱	مثنوی	ہجو موسم سرما
۲	" شکار نواب آصف الدولہ		۱۲	"	ہجو دولتمند بخیل
۳	" بطور خط		۱۳	"	ہجو میر ضاحک
۴	" ایضاً		۱۴	"	ہجو طفل لکڑی باز
۵	" معانی شعر مولانا روم رح		۱۵	"	ہجو حکیم غوث
۶	" تعریف چھڑی		۱۶	"	ہجو چیک میرزا فیضو
۷	" تعریف دیوان میر باتحان		۱۷	"	ہجو میاں فوقی
۸	" ہجو فیل نرپت سنگھ	دہلی میں لکھی گئی	۱۸	"	ہجو فدوی
۹	" ہجو فولاد خاں کوتوال	شاہجہاں آباد میں لکھی گئی	۱۹	"	حکایت شخص اہل کمال
۱۰	" موسم گرما		۲۰	"	بادشاہ و درویش

ہر قسم کا بہترین عطر کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

۲۱	مثنوی، حکایت مرد آزاد	۲۴	مثنوی، عشق درویش
۲۲	" " ہوس درویش	۲۵	" قصہ کدخدائی زنِ بدصورت
۲۳	" تعریف چاہ مومن خان	۶/	

مرزا سودا عشق کو عمدہ نظر سے دیکھنے کے علاوہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ خیال کرتے تھے چنانچہ ان کی پہلی مثنوی قصۂ عشق پسر شیشہ گر بہ زرگر ایسی ہی ہے اور نہایت ہی عمدہ اور بہترین مثنوی ہے خاصکر اس مثنوی کا بیان توحید نہایت عمدہ ہے مختصر ساقی نامہ اور بیان توحید کے بعد نعت کہکر موسم بہار کی تعریف کرکے قصہ شروع کرتے ہیں کہ ایک خدا رسیدہ درویش ان سے ملکر قصد کعبۃ اللہ کرتے ہیں اور میرزا صاحب بھی تیار ہوجاتے ہیں مگر روانگی کے بعد پانچویں منزل کے راستہ میں قزاق ملکر لوٹ لیتے ہیں۔ اور اس بُری طرح لوٹتے ہیں کہ پیراہن تک نہیں چھوڑتے۔ درویش کو اپنے سلطان کے لٹنے کا بہت رنج ہوتا ہے اور وہ ایک ایک چیز کی تفصیل کہہ کر اس طرح روتے ہیں۔

کبھو عمّامہ کے جانے کا مذکور ۔۔۔ کبھو تھا فکر پیراہن سے دل چور
سلیمانی کی گہ یاد آتی تسبیح ۔۔۔ ہوجاتی تھی جسکے غم سے تشریح
کبھو کہتے مصلا تھا چکن کا ۔۔۔ کہ جس پر تھا چکن کار دکن کا
کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا ۔۔۔ بڑے حضرت کے میرے ہاتھ کا تھا
کہا کیا پٹکا تھا میری کمر کا ۔۔۔ سفر در پیش آیا یہ کدھر کا
عقیق سرخ کا جو ناسداں تھا ۔۔۔ اگر بکتا تو قیمت میں گراں تھا

غرض بڑے میاں نے رو دھو کر میرزا صاحب سے کہا۔

ارادہ تھا کہ واں جاکر مریں ہم ۔۔۔ نچلے ہے گر خدا تو کیا کریں ہم

یہ سنکر مرزا صاحب نے کہا کہ اب گھر جانا بھی ممکن نہیں کیا منہ لیکے جائیں بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھیں،

کہا حضرت نے سنکر تم ہو گمراہ ۔۔۔ نہیں مسلے مسائل سے کچھ آگاہ
حرم کا قرض ہے معذور پر طوف ۔۔۔ گیا یاں مال آگے جان کا خوف

چونکہ بڑے میاں کے مریدان واثق بھی انہیں کے ہم خیال تھے اس لئے میرزا صاحب کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا اور جس راہ سے گئے تھے اسی سے لوٹے۔ پہلی منزل پر پہونچ کر بڑے میاں نے قصہ کہانی کی فرمائش شروع کی۔

کہا سودا نے حضرت کو تو ہے خبط ۔۔۔ مجھے قصہ کہانی سے ہے کیا ربط
کہوں اک شہر کی میں واردات اب ۔۔۔ جو گوش ہوش سے اب سنیں سب

خالص عطر کہاں سے خرید کرنا چاہئے اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے

اس کے بعد ایک ساقی نامہ لکھکر اصل قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شیشہ گر کا لڑکا نہایت ہی حسین جمیل تھا اتفاقاً ایک زرگر کے لڑکے پر مائل ہو گیا اور اس کی حالت بدلنے لگی جسے دیکھکر تعویذ ٹوٹکے شروع ہوئے مگر اسکی حالت نہایت ہی خراب ہو گئی اور وہ گھر سے نکل گیا، اس کے والدین کی آہ وزاری محلے والوں کی بے قراری مرزا صاحب نے نہایت ہی کاوش سے بیان کی ہے، غرض وہ لڑکا بہت دور چلا جاتا ہے اور ایک منجم کی رہنمائی سے اس کے والدین اسے ڈھونڈھ کر لاتے ہیں مگر گھر آکر بھی وہ وحشت زدہ رہتا ہے اور زرگر کا لڑکا جذب محبت سے متاثر ہو کر شیشہ گر کے لڑکے کے پاس آتا ہے اور دونوں خوب بھیچ بھیچ کر گلے ملتے ہیں خوب خوب گلے شکوے ہوتے ہیں، اتنا لکھکر مرزا صاحب فرماتے ہیں

کسی سے میں نے یہ قصہ سنا تھا — پر اب اظہار سے یہ مدعا تھا

طلب میں وہ جواں اک شیشہ گر کا — ہوا عاشق جو اک زرگر پسر کا

رہا از بسکہ عشق اس کے میں محکم — ہوئے اک روح دو قالب وہ باہم

جو کوئی آپ کو اس طرح کھووے — خدا کا وہ خدا تب اس کا ہووے

ہوا زرگر پسر جوں اس میں موجود — محبت یوں ہو تو ہو عبد معبود

محبت حق کی جسمیں یوں در آئی — کرے ہے بندگی میں یوں خدائی

جو حق کے عشق میں ثابت قدم ہو — مکانِ دیر بھی اس کو حرم ہو

جو آگے اس کے ہو دیوار یا در — نہ سمجھے حق سے خالی ہے یہ اب گھر

خدا کب عشق کو ایسے کے مانے — جو اس کو ہر جگہ حاضر نہ جانے

اسکے بعد کہتے ہیں:-

سنی حضرت نے یارو یہ کہانی — اگر سمجھیں زراہ نکتہ دانی

تو لوں میں دوڑ کر ان کے قدم چوم — وگرنہ یاں ارادت اپنی معلوم

بھلا ٹک منصفی کے ہو کے در پے — کہو یارو یہ سچ ہے یا غلط ہے

لگی ہو گر بری تم کو یہ تقریر — نکل تو کیجئے سودا کی تقریر

یہ مثنوی نہایت ہی دردانگیز ہے اور ساتھ ساتھ ایک اخلاقی پہلو بھی موجود ہے اور پھر ان مشائخاں عظام کی قلعی بھی اچھی طرح کھولی ہے یہ مثنوی کے بڑی اور (۵۰۰) شعر کی ہے کلام میں سادگی، واقعہ میں صداقت اور سلاست وروانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ان چند گنتی کے مثنویوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے جو ادب اردو کی مایۂ ناز ہیں۔

مثنوی دربیان عشق درویش زادہ نشین، افسوس ہے کہ میرزا صاحب نے اس مثنوی کا کوئی نام ہی نہ رکھا بلا کسی نام کے بسم اللہ لکھکر شروع کر دیا ابتدا میں ۱۲ شعر بطور مناجات کے ہیں جسمیں دردِ دل طلب کیا ہے یہ بہترین مناجات ہے ہر ایک مصرع درد میں ڈوبا ہوا ہے

افشانی قوام کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب دل کا پر اثر کلام ہے۔ حمد میں (۱۱) اور نعت میں (۱۰) شعر کہکر ایک چھوٹی سی (۴۲) شعر کی مناجات کے بعد قصہ شروع کیا ہے کہ ایک صاحب دل درویش آبادی سے دور ایک قطعہ جنت نظیر میں تنہا رہا کرتے تھے اتفاقاً ایک بارات جاتی ہوئی وہاں ٹھیری، دلہن کی ڈولی بھی شاہ صاحب کی منڈلی کے قریب رکھی گئی جب لوگ ادہر اودہر ہٹ گئے تو دلہن نے گرمی سے اکتاکر ڈولی کا پردہ اٹھا ادہر اودہر دیکھنا شروع کیا اتفاقاً شاہ صاحب کی نظر بھی اسپر پڑگئی اور وہ دل دے بیٹھے۔ جب برات روانہ ہوئی تو شاہ صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور دور تک اسے بصد آہ وزاری حسرت وافسوس دیکھا کئے جب برات نظروں سے اوجھل ہونے لگی تو آپ ایک درخت پر چڑھ کر معائنہ کرنے لگے جب یہاں بھی نظر نے جواب دیدیا تو آہ کرکے درخت سے گر پڑے جسد خاکی زیر درخت پڑا رہا اور روح برات کے ساتھ ہوگئی۔ شاہ صاحب کے معتقدوں نے وہیں دفنا دیا جہاں کہ وہ رہا کرتے تھے، عشق کا یہ اثر بھی دیکھیے کہ دلہن گھر پہونچکر رونے پیٹنے آہ وزاری کرنے لگی، ہزاروں گنڈے کئے گئے مگر کچھ نہ ہوا آخر دولہا والوں نے دلہن کے والدین کو اطلاع کی اور وہاں سے لوگ لینے کے لئے آئے جب وہ دلہن کو اپنے گھر لے چلے تو ایک بوڑہی دلالہ بھی دلہن کی ڈولی کے ساتھ ہوگئی تھی شاہ صاحب کے مزار کے پاس پہونچکر اس نے سب کو رائے دی کہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرنا چاہئے ممکن ہے کہ کھلی ہوا سے دلہن کو تسکین ہو غرض ڈولی رکھی گئی اور سب لوگ ٹھہر گئے۔ دلہن تڑپ کر ڈولی سے نکل پڑی اور شاہ صاحب کی قبر پر آئی جونہی وہ قبر پر پہونچی قبر شق ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لئے شاہ صاحب سے وصل ہوگئی۔

اسی صورت سے یہ غلطاں تھی کچھ دور — کہ جذب عشق نے ٹکڑے کی وہ گور
اٹھا درد دل اس جاگہ کچھ ایسا — نظر آنا جسے کہتے ہیں کیسا
نجانے پھر کہ داں کا حال کیا تھا — یہی وہ گور تھی یا اژدہا تھا
کیا جن نے تامل ایک دم میں — لیا اوس نازپرور کو شکم میں
اوسے اوس گور نے اس طرح کھایا — نہ ماہی بیچ یونس یوں سمایا

دلہن کے رشتہ دار روتے پیٹتے واپس ہوگئے چند شعر قصہ کے متعلق اور اپنی کاوش طبع کا تذکرہ کرکے میرزا صاحب نے مثنوی ختم کر دی ہے یہ مثنوی بھی اخلاقی مثنوی ہے اور عشق مجازی کی حقیقی داستان کہلانے کی مستحق، اس مثنوی کے کل شعر (۳۶۲) ہیں

مثنوی کدخدائی دوست۔ یہ مثنوی بھی طویل اور اخلاقی ہے مگر نام ندارد قصہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے ایک دوست مدت کے بعد ملتے ہیں مگر انکی حالت بدلی ہوئی نظر آتی ہے یعنے

دیکھتا کیا ہوں کہ عالم اور ہے — گرد رخساروں کے خط کا دور ہے
تک دہواں سا اٹھ رہا ہے آگ سے — اڑ گئے ہیں جیسے منہ کے بھاگ سے
نے وہ شوخی نے وہ لڑکا پن رہا — نے وہ صورت ہے نہ وہ جوبن رہا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا امتحان کیجیے اور عطر نگار استعمال کیجیے

پڑ گئیں ہیں منہ کے اوپر جھائیاں — ناک پر بھی آگئی ہیں سیاہیاں

چہرہ مسّوں سے ہے سارا بدنما — رنگ منہ کا اڑ گیا جیسے ہُما

چاند پر بادل کہ جیسے چھا گیا — مورچہ جوں مغربی کوں کھا گیا

منہ پہ سبزی اور سیاہی جم گئی — جس طرح پانی پہ کائی جم گئی

ہو گیا اک مرتبہ ہی سبز رنگ — جیسے آئینے کو کھا جاتا ہے زنگ

مرزا صاحب وجہ پوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے

بیاہ کے کرنے سے ہوتی ہے خوشی — میں نے دیکھا تو یہ ہے مردم کشی

جب تلک اک عالم تجرید تھا — ہکو جو دن تھا سو روز عید تھا

یہ کہکر اپنی شادی اور دلہن کی زشت روئی کا تذکرہ بڑی ہی متانت سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں

لوگ تو خوشوقت اور خرم ہوئے — اک گرفتار مصیبت ہم ہوئے

اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ جب چند روز یکجائی رہی تو ان کی نیک بخت نے یہ پوچھا۔

جس سے اب فرمائے اس سے چھپوں! — کس کے آگے ہو نہیں اور کس سے چھپوں؟

یہ سنکر آپ فرماتے ہیں۔

جان میری ہو جئے سب کے حضور — ایک اس عاصی سے رہئے دور دور

اپنا منہ سارے قبیلے کو دکھاؤ — پر خدا کے واسطے مجھ سے چھپاؤ

یہ تو جلدی سے کہیں یارب مرے — ایسا تیسا ہو جو بیاد اب پھر کرے

یہ سنکر مرزا صاحب اپنے دوست کو ایک طویل نصیحت کرتے ہیں کہ ہر ایک کو خداوند عالم نے بنایا ہے اور کسی بدصورت پر اعتراض کرنا اس صانع یعنی خداوند عالم پر معترض ہونا ہے، اور پھر کہتے ہیں کہ حسن عارضی ہے مثلاً تم ہی ایک زمانہ میں حسین تھے مگر اب غور کرو کیا ہو، پھر مرنے والے حسینوں کا ذکر کرکے سمجھاتے ہیں،

آدمی کو چاہئے وارستگی ہو — صورت فانی سے کیا دلبستگی ہو

اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مدت سے یہ رونا رو رہے ہیں خدا مشاطہ کا بھلا کرے ان کے طفیل میں کیا کیا مصیبتیں نہیں نازل ہوتیں،

اس مثنوی میں سودا کے خیالات کا حقیقی پرتو نظر آتا ہے اور ان کے اعتقادات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ یہ (۱۱۰) شعر کی مثنوی انکی کلیات کی آخری مثنوی ہے۔ مثنوی در تعریف شکار نواب آصف الدولہ ؎

سرِ صفحہ پہ آج یوں صبح دم — لگا دستِ سودا میں کہنے قلم

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا ٹیلیفون نمبر ۱۳۹ ہے

جو اس عہد میں ہند کا ہے وزیر　　　ہمت جوان و بتدبیر پیر

یہ ہے آصف الدولہ جسکا ہے نام　　　سلیماں شکوہ و ذوی احتشام

کہکر آصف الدولہ کے شکار کی تعریف کی ہے، تمام درندے، پرندے، جانوران آپ ہی سب کو شکار کرا دیا ہے، آخر میں ہاتھیوں کو زندہ لانے کا تذکرہ کیا ہے۔

نگرواں سے جیتے کئی پیل لائے　　　سو حلقہ بگوش اس کے وہ ہو گئے

سبھی پیل ہر چند محبوب ہیں گو　　　سواری کی خاطر بہت خوب ہیں

پر اک پیل کا ان میں ایسا جمال　　　زبان وصف میں جسکے میری ہو لال

کبھو پیل ایسا بجسم جہاں　　　نہ آیا نظر زیر نہ آسماں

وہ ہے قد و قامت میں اتنا بلند　　　لگا کہنے دیکھ اس کو ہر ہوشمند

بلاغت اپنے یہ ہاتھی نہیں　　　ہوا دیکھ اسکو مجھے بالیقین

رہے جب نہ واں صید سو سو کروہ　　　تو زنجیر کو کھینچ لائے ہیں کوہ

نہیں اسکی خوبی میں ذرہ قصور　　　خدا چشم بد سے رکھے اسکو دور

ترے سائے میں یہ جئے تا ابد　　　تجھے پرورش کی رہے اسکے کد

اس مثنوی کے کل (۳۵) شعر ہیں جو مختصر اور دلچسپ ہیں۔

مثنوی بطور خط۔ یہ مثنوی کسی خاں صاحب کو بطور خط لکھی گئی ہے اسمیں اپنی محبت اور دوری (۳۸) شعر میں دل کھول کر بیان کی ہے شعر پر درد اور عمدہ ہیں۔ مثنوی دوم بطور خط یہ بھی مثنوی کسی کو بطور خط لکھی گئی ہے

پہلے پہونچے میری طرف سے سلام　　　کہ یہی ہے طریقۂ اسلام

سے شروع کیاہے یہ خط جو آیا لکھا گیاہے (۱۹) شعر ہیں بڑے مزے کی مثنوی کہی ہے مثنوی در بیان معانی بیت مثنوی شریف۔ مولانا روم کے اس شعر

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　　هفصد و هفتاد قالب دیدہ ام

کی تشریح کی ہے۔

مدعا اگنے سے ہے نشو و نما　　　ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا

ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا　　　خلقت خالق میں بد اور نیک کا

لیکے تا انساں سے تا وحش و طیر　　　دیکھنی قالب سے مطلب اسکی سیر

یوں کلام مولوی دے ہے خبر　　　یعنی میں جس دل میں دیکھا بیٹھکر

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے عطر حنا کا نسخہ کسی دوسرے عطر ساز کو دستیاب نہ ہو سکا

کچھ نظر آیا نہ غیر از اسکی ذات — اس قدر پایا محیط کائنات

معنی ہم اس شعر کے سمجھے ہیں یوں — اور کی فہمید میں کچھ اور ہوں

اس مختصر مثنوی میں صرف (۲۳) شعر ہیں۔

مثنوی در تعریف چھڑی۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز — سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

کھینچ نہ سکے جہاں شمشیر و تیغ — اسکو لگا بیٹھئے واں بے دریغ

اتنا کم آزار اور ایسا شفیق — اور بھی کوئی ہے کسی کا شفیق

چوب نہیں دلبر خوشخو ہے یہ — یار ہے یہ قوت بازو ہے یہ

غرض (۳۵) شعر چھڑی کی تعریف میں کہے ہیں اس کے خاندان کی تفصیل بھی ظاہر کی ہے آخر میں کہتے ہیں۔

لکڑی کی نسبت سے تو معذور ہے — آدمی ہونا تو بہت دور ہے

مثنوی در تعریف دیوان مہربان خان۔ یہ مثنوی مہربان خان کے دیوان اور اشعار اور ان کی سخاوت و ہمت کی تعریف میں لکھی گئی ہے (۴۱) شعر کہے ہیں مگر صرف دوستی میں صلہ کے لئے نہیں چنانچہ خود ہی کہتے ہیں۔

لیکن اس نظم سے نہ سمجھیو تو تو — کہ صلہ سے غرض ہے سودا کو

اس سے رکھتا ہے یہ دل مہجور — مہربان دوستی تیری منظور

اس مثنوی میں اصناف شعر پر بھی مختصر نظر ڈالی ہے۔

حکایت (۱) ”مرد اہل طریق“ کی حکایت نظم کی ہے کہ وہ جب کسی مجلس میں بیٹھتا تو کبھی نہ اٹھاتا تھا کسی نے سبب پوچھا تو کہا۔

تو کز محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہ (۱۱) شعر بالکل ناصحانہ انداز میں کہے گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ نہایت ہی عمدہ ہیں نصیحت کا طریقہ دیکھو کتنا دلچسپ ہے۔

حکایت ۲۔ اس کے بعد اور ایک حکایت نظم کرتے ہیں کہ شاہان عجم میں سے ایک بادشاہ ”درد قولنج“ میں مبتلا ہوگیا، ہزاروں علاج کئے مگر شفا نہ ہوئی آخر میں ایک فقیر نے بادشاہ سے ایک اقرار نامہ اس مضمون کا لکھوا کر شفا ہو جائے تو سلطنت دے دیگا۔ دعا کی اور بادشاہ تندرست ہوگیا جب بادشاہ ——— کو شفا ہو گئی تو اس نے درویش سے سلطنت کا بار سنبھالنے کو کہا۔

کہا مرد درویش نے اے عزیز — اسے چاہئے شخص پر بے تمیز

کہ خواہش ہیں اس سلطنت کی دہر جان — کہ وابستہ اک گو تو ہے ہے نداں

یہ دنیا جہاں جائے پیچند ہے — عبث دل ترا اسجگہ بند ہے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے مال طلب کرنے کے بعد اگر ناپسند ہو تو قیمت واپس لیجئے اور محصول کا ذمہ دار کارخانہ ہے

مسلم ہوا جب کہ ہونا ہلاک — چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

یہ (۲۳) شعر کی مثنوی پُر اثر و عجیب اور ناصحانہ ہے، ان حکایتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے اعتقادات کیا تھے اور خیالات کیسے :-

حکایت ۳ - یہ مختصر سا قصہ ہے کہ ایک شخص آزاد مزاج جب تک گھر میں رہتا کواڑ بند کر لیتا اور جب باہر جاتا تو دروازے کھول کر چلا جاتا تھا اس حکایت کے (۱۱) شعر ہیں

حکایت ۴ - ایک مہوس کا قصہ بڑا عجیب نظم کیا ہے کہ وہ کیمیا کا شائق تھا ایک درویش کے پاس جا کر اس نے کیمیا کا نسخہ مانگا درویش نے نسخہ بتلا دیا اور کہا کہ جب نسخہ بنانے بیٹھو تو بندر کا خوف یا خیال دل میں نہ آنے دینا ورنہ نسخہ نہ بنے گا۔ مہوس نے کہا یہ بات ممکن نہیں جو خطرہ دل میں ہو وہ کہیں نہ جائے گا اگر آپ کو نسخہ بتوانا ہی تھا تو اسے آگاہ ہی نہ کیا ہوتا کہ بندر کا خطرہ نہ لاؤ مگر۔

نہ سمجھا غرض اس کے رمز و نکات — کہ پردے میں تھی مرد عارف کی بات

کہ جب دل کو خطرے پہ قادر کیا — تو پھر ہیچ ہے خطرۂ کیمیا

مثنوی در تعریف چاہ مومن خان - مومن خان کی چاہ کی تعریف میں (۱۸) شعر کہے ہیں شروع میں پل و مہمان سرا و مسجد و چاہ بنانے کی ترغیب دی ہے تاکہ نام باقی رہے۔ یہ بالکل معمولی مثنوی ہے، ان مثنویوں کے بعد ہجو ہے جیکے مرزا صاحب بادشاہ تھے، چونکہ یہ ہجو بھی مثنوی کی بحر میں ہیں اس لئے انھیں بھی مثنوی کی تحت میں شمار کیا جاتا ہے انشاء اللہ مرزا صاحب کی ہجو پر ایک مستقل مقالہ سپرد قلم کیا جائیگا۔

مثنوی در ہجو فیل راجہ نرپت سنگھ - خود سرائی سے تمہید کا آغاز ہے اور پھر راجہ کے ہاتھی کا بیان - دنیا بھر کے عیوب ہاتھی میں دکھلائے ہیں اور اسکی لاغری کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔

علامہ آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا نے جو راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں مثنوی لکھی ہے اس کے جواب میں بھی کسی شخص نے مثنوی لکھی ہے اور خوب لکھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎ — تم اپنے فیل منے کو نکالو تو — مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو تو

مگر افسوس ہے کہ یہ جوابی مثنوی نہ ملی ورنہ بڑی اچھی چیز تھی - مرزا صاحب کی یہ ہجو (۷۱) شعر کی ہے اور خوب ہے بڑی بات یہ ہے کہ عریانی کا زیادہ دخل نہیں ہے۔

مثنوی در ہجو شیدی فولاد خان کوتوال شہر شاہجہان آباد - یہ بڑی دھوم دھام کی ہجو ہے معلوم نہیں فولاد خاں نے مرزا صاحب سے کیا گستاخی کی تھی جسکا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا، فولاد خاں کی رشوت ستانی اور چوروں کی سینہ زوری خوب بیان کی ہے (۱۷) شعر کوتوال ہی کی ہجو میں ہیں آخر میں بکمال انصاف فرماتے ہیں۔ — یہ جو سودا بکے ہے لایعنی — آپ کرتا ہے دزدیٔ معنی

مثنوی موسم گرما - یہ بھی ہجو یہ مثنوی ہے جسمیں (۱۸) شعر موسم گرما کی ہجو میں کہے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب کہے ہیں خزاں کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے۔

کارخانہ اصغر علی محمد علی سو سال سے لکھنؤ میں قائم ہے۔ تار کا پتہ "حنا" لکھنؤ ہے

مثنوی در ہجو موسم سرما۔ یہ ہجو بڑی پرکیف ہے ذرا انہماک سے مطالعہ کیجئے تو مارے سردی کے دانت بجنے لگیں نہایت ہی فراخدلی سے ۸۵ شعر ایسے گرم لکھے ہیں کہ سردی کا سماں سامنے آجاتا ہے۔

سودا آخر ہے سردی کا مذکور   شعر بھی گر خنک ہوں رکھ معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا   ہوگئی ہے زبان بھی اولا

مثنوی در ہجو امیر دولتمند۔ یہ مثنوی حمد سے شروع ہوتی ہے ۷ شعر کہکر فرماتے ہیں،

سنو یارو کروں ہوں میں اک نقل   جسکو باور کرے نہ ہرگز عقل

اپنے ایک دوست کی حکایت فرماتے ہیں کہ وہ کسی ملنے والے کے گھر گئے اتفاقاً وہاں پہونچتے ہی ابر امنڈ آیا جسکو دیکھکر صاحب خانہ سخت گھبرایا۔

نہ خبر ان کی پوچھی نہ احوال   بیٹھتے ہی کیا یہ انسے سوال
کچھ ہوا پر بھی تم رکھو ہو نگاہ   گھو نگھڑی بٹو کچھ بھی ہے ہمراہ

انھوں نے کہا کہ مجھے بارش کا حال معلوم نہ تھا ورنہ میں ضرور لاتا، مگر صاحب خانہ اسپر بھی نہ سمجھے جھٹ "بارانی" لاکر سامنے رکھدی مگر مہمان بھی ترے کورے ہی نکلے انھوں نے جانے کا نام ہی نہ لیا بلکہ وہیں سونے کی ٹھان لی یہ معلوم کرکے بخیل میزبان کی جان ہی تو نکل گئی۔ جب پانی نہ تھما تو دعا کرنے لگے کہ اس قدر بارش ہو کہ دنیا غرق آب ہو جائے مگر افسوس کہ یہ بھی نہ ہوا، تو ناچار بیٹھکر باتیں کرنے لگے جب کھانے کا وقت آیا تو "جائے ضرور" میں آفتابہ رکھوا کر خود تشریف لے گئے اور مہمان کے کان میں کہدیا کہ۔

چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو   کہدو بلوا کے اب بکاول کو

مہمان نے بکاول کے لئے "فریاد" شروع کی جو بعد از "ساجت بسیار" آیا تو مہمان صاحب نے پوچھا کہ کچھ تیار ہے؟

بولا تیار تو نہیں ہے کچھ   جاؤں ڈھونڈوں اگر کہیں ہے کچھ
تو تو لاؤں ہوں آپ کی خاطر   ورنہ کہاؤ مجھے میں ہوں حاضر
بولے یہ کچھ اگر نہیں تیار   دیکھو ہووے گا مودی سرکار
اس سے تم جاکے جنس منگواؤ   واسطے میرے کچھ تو پکواؤ
لگا کہنے وہ کوئی مانے ہے   آپ ہی بھڑوا خاک چھانے ہے
جب کہ اس کا حساب ہوتا ہے   جان کو وہ برسوں کی روتا ہے
اور قصاب بھی جو آوے ہے   چھری بغدا مجھے بتاوے ہے

اسی طرح بخیل دولتمند کی ہجو کہکے ایک قصہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا تھا جنے اپنے ایک دوست کی ضیافت کی اور وہ بھی "اک رکابی طعام دیگر ہیں"

تمباکو خوردنی کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

اسپر دولتمند کا بگڑنا اپنی بیوی اور بیٹے پر خفا ہونا بڑے مزے سے بیان کیا ہے بہرحال بخیل کی پیٹ بھر کر ہجو کی ہے نسبتاً اور ہجوؤں کے یہ ہجو زیادہ مہذب ہے۔

"مثنوی در ہجو میر ضاحک"۔ میر ضاحک سید اور امام ہردی کی اولاد سے تھے، پرانی دلی کے شریف اور باوضع بزرگوں میں شمار ہوتا تھا محض سودا کی ہجوؤں کی وجہ سے اب تک میر صاحب کا نام باقی ہے ورنہ ان کی اپنی کوئی چیز ایسی نہیں جو باعث شہرت ہو بعض لوگوں کو سودا پر اعتراض ہے کہ انھوں نے ایک سید کی ہجو کہی مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ پہل مرزا صاحب سے نہیں ہوئی۔ علامہ آزاد فرماتے ہیں۔ سودا نے جو ان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ کسی موقع پر انھوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا خود آپکے پاس گئے اور کہا آپ بزرگ ہیں میں خورد آپ سید ہیں میں آپکے جد کا غلام، عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ ارشاد فرمائیں ایسا نہ کیجئے گا کہ مجھ گنہگار کے منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپکے جد کے سامنے روسیاہ ہوں تلامیذ الہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں ان کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھی یہ شاعری ہے اسمیں خوردی اور بزرگی کیا؟ سودا آئیں تو جائیں کہاں پھر جو کچھ انھوں نے کہا خدا نہ سنوائے یہ بھی بزرگوں سے سنا کہ مرزا نے جو کچھ ان کے جناب میں یاوہ گوئی کی ہے میر موصوف نے اس سے زیادہ خراب و خوار کیا، لیکن وہ کلام عجیب طرح فنا ہوا، میر حسن مرحوم ان کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے، بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت عذر کئے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال کیا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگوا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادتمندی اسی وقت دیوان باپ کے گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔ لیکن چونکہ سودا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اس لئے قائم رہیں، انکا کلام اسی مجلد کے اندر تھا جو مفقود ہوگیا"

مرزا نے دل کھول کر میر ضاحک کی ہجویں کہی ہیں۔ اس ہجو میں میر صاحب کو "پیٹو" قرار دیا ہے۔ اور انکی "جوع البقر" بے حیائی وغیرہ کا تفصیلی منظر دکھایا ہے یہ ہجو یہ مثنوی بھی طویل ہے۔

"مثنوی ہجو طفل لکڑی باز۔ گو یہ ایک ہجو ہے مگر بہترین ناصحانہ مثنوی ہے ——— اس سے بہتر انداز نصیحت شاید ہی ہو سکتا ہے۔

نالے پر ایک لڑکا رہتا تھا　　باپ سے اپنے روز کہتا تھا
موئے جاے سے مجھکو ذوق نہیں　　چھوڑے جیرے کا دکو شوق نہیں

اپنی فرمائشات کی طویل فہرست گنا کر لڑکا کہتا ہے،

جو کہ جاگیر سے اب آتا ہے　　سب ترے خرچ بیچ جاتا ہے
تو ہے شراب و بھنگ و افیم　　اب خدا کا بھی تجھ کو ہے کچھ بیم

ہر قسم عطریات منگانے کا پتہ:- صغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ

لے ہے نقدی کے بیسیوں آپ تمام — اسمیں سے بھی مجھے نہ دیا کدام
مجھ سے بیٹے کو روز چھ پیسے — سو بھی دے ہے فقیر کو جیسے

جب سعادت اطوار نے باپ کی تمام بُرائیاں بیان کردیں تو اس نے جواب دیا،

ہم غریبوں کی دال روٹی ہے — گاہ پتلی ہے گاہ موٹی ہے
موٹا کپڑا ہے تاش سے بہتر — دربدر کی تلاش سے بہتر

بزرگوار نے بکمال پسر نوازی ایک اور ترکیب بھی بتلادی،

اپنے اوپر کسی کو کر عاشق — یا ہو وہ پاکباز یا فاسق
نخرے سے اس کی گود میں جا لیٹ — کھول چھاتی کو اور دکھا کر پیٹ
جب تو جانے وہ ہو چکا محکوم — چاہ اس کی ہو تجھ ا پر معلوم
مانگ تب اس سے چڑھنے کو گھوڑا — تب ہے کس بات کا تجھے توڑا
تب تو بیٹا یہ بولا ہو کڑوا — ہائے یارو یہ باپ یا بھڑوا

برخوردار اسیطرح کی چند اور مغلظات سناتے ہیں اور بزرگوار نے ؎ غرض ان سے یہ گالیاں کھا کر — دہی چھ پیسے پھر دے لا کر
یہ کہکر مرزا فرماتے ہیں ؎

دیکھو یارو عجب زمانہ ہے — بیٹے سے باپ کیا بگانہ ہے
باپ سے بیٹا نا امید ہوا — خون دنیا کا کیا سفید ہوا
الغرض باپ سے وہ ہو کے جدا — ملنے لاگا ہر ایک سے جا جا
تھے محلے کے بیچ کئی عشاق — جنمیں تھے مرزا معنت بر جی طاق

یہ سعادت مند مرزا معنت کی تعلیم میں جانے لگے، اور انھوں نے کشتی سکھانا شروع کیا مگر اسی کشتی میں ایک داؤں ایسا باندھا کہ کہتے نہ بنے گو بہت سمجھایا منایا مگر ایک پیش نہ گئی اور لڑکا یہ کہتا ہوا وہاں سے نکلا،

سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم — اس نصیحت کو گوش جان سے تم
باپ کے گھر کی چاٹ کر چٹنی — کرو گزران یارو تم اپنی

گو یہ مثنوی کسی قدر عامیانہ ہے مگر کشتی گیروں کے طبقے کا سچا فوٹو اور ایک ناصحانہ نتیجہ خیز مثنوی ہے

"مثنوی در ہجو حکیم غوث" نہ جانے یہ حکیم غوث کون تھے اور مرزا صاحب ان سے خفا کیوں ہو گئے تھے کہ ایک مثنوی ہجو میں (۱۷) شعر کی کہدی حکیم جی کا حلیہ کس متانت سے بیان کرتے ہیں ؎ شکل ہے شیطان کی اور غوث نام — جگ میں ہلاکو کا ہے قائم مقام

خالص عرق نعناع اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

حکیم جی کا ایک ادنیٰ سا معجزہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی دردِ سر کے مریض کو دیکھکر دق تجویز کر دیا اور نسخہ میں معجون زرانباد لکھ دی اور ایک شخص کی نبض دیکھکر قبض کہا اور سفوفِ بیو دلکھ مارا۔

اور غذا اس کو یہ بتلائی درست　　ماش کی روٹی سے تو کھا ساگ پوست

صاحب بیچش کو بتلایا کتول　　واسطے ہیضے کے لکھا اسپغول

کہدیا مجنون کو شیر شتر　　کہدیا مستسقی کو جا نصد کر

پوچھا جو ادن نے کہ غذا کیا کہی　　ساتھ گلتھی کے کہا کھا دہی

اسیطرح اور بہت سے معجزے لکھے ہیں، اور آخر میں ایک مریضہ کا ذکر کیا ہے جسے دیکھکر حکیم جی لقوہ اور فالج تجویز کرتے ہیں اور خوب پٹتے ہیں۔
ممکن ہے کہ یہ واقعات ہوں اب بھی بعض جگہ ایسے حکماء حکمت شعار و طبابت آثار نظر آتے ہیں۔

مثنوی در ہجو جبک مرزا فیضو ۵　　میرزا فیضو کے جبک مر گئے　　تو تنہا نے جگ کے ویراں کر گئے

تمام پرندوں کے نام لیکر ان کے خوش منانے کا تذکرہ کیا ہے اور مرزا کی بیچارگی اور مفلسی کا حال بھی لکھا ہے۔ آخر میں جبک کی تعریف اسطرح کی ہے

کیا کہوں جبک تھے یا یا شین تھے　　باز کے بچے تھے یا شاہین تھے

اور آخر میں مرزا جی کو پرسا بھی دیا ہے۔ یہ ہجو یہ مثنوی (۷۹) شعر کی ہے معلوم نہیں اب جبڑی مارے کیوں بگڑ بیٹھے جو غریب کی ہجو کہدی اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو پرندوں کے متعلق بھی اچھے معلومات تھے اور شکاریوں سے بھی خوب واقف تھے

مثنوی در ہجو میاں فوقی - علامہ آزاد اس ہجو کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ "ہجوؤں میں ایک ساقی نامہ ہے جسمیں فوقی شاعر کی ہجو ہے۔ اصل میں قیام الدین قائم کی ہجو میں تھا وہ بزرگ باوجود شاگردی کے مرزا سے منحرف ہو گئے تھے، جب یہ ساقی نامہ لکھا گیا تو گھبرائے اور آخر کار خطا معاف کرائی مرزا نے انکا نام نکال ڈالا اور فوقی ایک فرضی شخص کا نام ڈال دیا"۔ پہلے ایک ساقی نامہ کہا ہے، اور پھر میاں فوقی کو میدان میں آنے کی دعوت دی ہے اور پھر ان کے سرقہ کا تذکرہ کر کے کہا ہے کہ آپ کی ایک غزل میرے پاس موجود ہے۔

مولانا روم کے دو شعر -　　بشنو از نے چو حکایت میکند　　وز جدائی ہا شکایت میکند

کز نیستاں تامرا ببریدہ اند　　وز نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

کہکر بعض نہایت ہی درد انگیز شعر کہے ہیں یہ (۱۲۰) شعر کی مثنوی ہے آخر میں فوقی کے شعر بھی دئے گئے ہیں اور اس کے سرقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے
مثنوی در ہجو فدوی پنجابی - علامہ آزاد فرماتے ہیں کہ فدوی اصل میں ہندو تھے مکند رام نام تھا۔ مسلمان ہو گئے تھے پنجاب وطن تھا علم کم مگر طبیعت مناسب تھی شعر اردو کہتے تھے۔ ماہر علی شاہ کے شاگرد تھے اور فقیرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے مشاعرہ میں جاتے تو کبھی بیٹھتے کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے اور چلے جاتے تھے، جب انھوں نے قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیے

انعام دی ان کا بھی دماغ بلند ہوا اور دعویٰ ملک الشعرائی کا کرنے لگے کچھ مرزا پر اعتراض کئے اس پر مرزا نے الو کی اور بنئے کی ہجو کہی، انجام کو طرفین کی ہجویں حد سے گزر گئیں،" مرزا نے جو کچھ کہا وہ بچے بچے کی زبان پر ہے انھوں نے جو کہا وہ ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا، انھیں میں سے ایک شعر ہے کہ فدوی کی طبع موزوں سے مرزا صاحب کی شان میں واقع ہے۔

دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا　　　　کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا

یا ع بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے، مرزا صاحب نے ایک حمدیہ شعر کہکر سچ بولنے کی تلقین کرتے ہوئے فدوی کا تعارف اس طرح کرایا ہے ؎

فہم ہے سرتا قدم اور سراپا تمیز　　　　وارد احمد نگر ایک ہیں مرد عزیز

اس کے بعد ان کے اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کے اعتراض کا جواب دیا ہے، اور ایک نقل لکھی ہے کہ ایک شخص کسی بنئے کا قرضدار تھا اور بنئے کے تقاضوں سے بتنگ آچکا تھا اتفاقاً ایک الو اس کے ہاتھ لگا اور اسے باز کی طرح ہاتھ پر بٹھا کر بنئے کی دوکان کے سامنے سے چکر کاٹنا شروع کیا، اس آدمی کی اور بنئے کی گفتگو نہایت ہی مزے سے بیان کی ہے مارواڑیوں کی اردو کا نہایت ہی صحیح نمونہ دیا ہے۔

فرماتے ہیں ؎

پر کہاں سے کہوے چلے اس کو کدھر　　　　ہنسکے لگا پوچھنے "کہے جی یہ جانور"

جب بنئے سے کہا جاتا ہے کہ یہ باز ہے اور بادشاہ و وزیر اس سے شکار کھیلتے ہیں تو ؎

سانچ کہو پر کہا باج اسکا ہے ناؤں　　　　ہنسکے کہا بنئے نے یہ مرگ ہے یہ اپچ بہاؤں

جب بنئے نے خوب پوچھ گوچھ کرلی تو گھر گھر باز کا بھاؤ دریافت کرنا شروع کیا ؎

ایک کھریدار کو اس کا گہنا چاؤ ہے　　　　سانچ بتاؤ مجھے باج کا کے بھاؤ ہے

باز کی قیمت دریافت کرکے بنئے نے باز کا خرید نا طے کرلیا اور رات کو اپنی بیوی سے مشورہ کرنے لگا،

اس کے نکد بلنے کی مجھکو نہیں ہے اب آس　　　　پیسے میرے کھرچ ہیں ایک سپاہی کے پاس
اسکو کھریدوں میں اکال کو جودہ بنے　　　　باج بڑا ہی سا ایک دیکھا میں اسکے کنے
اسکو رسولی ہے ناس اس سے ہیں بیر ہے　　　　بولی بنینی یہ سن ادت تجھے کیر ہے
ناہ ری پر بہادتی رام کی سوں دو دیہات　　　　ہنسکے کہا بنئے نے کہی پیہ تینے بات
تھوڑے گننے کو نہ سوچ جو بکی تو بیچ گھیر　　　　بولی یہ جو سانچ ہے لاکے اسے تو سویر

جورو کے مشورہ کے بعد صبح صبح سیٹھ جی بغل میں بہی دابے کان پر قلم رکھے سپاہی کے گھر پہونچ گئے اور لڑا جھگڑا کر تین سو روپیہ کو باز خرید لیا اور گھر لاکر جورو سے کہا، ؎

رام جی کے پیجل سے آج ہمیں راج ہے　　　　دیکھ تو پر بہادتی پر کہکے باج ہے
یہ تو جناور ہے وہ ترک کہیں جسکو بوم　　　　دیکھ کے اون نے کہا ادت تجھے ہے لوم

ہر موسم میں عطر موتیا اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کیجئے

نانوں نہیں یوین ہیں برہتی میں اکا سیر	کھویا گرج ساتھ تین نکد روپیہ کا ڈھیر

یہ سنتے ہی سیٹھ جی سیاہی کے گھر پہونچے مگر وہاں رکھا کیا تھا وہ تو گھر سے غائب ہو چکا تھا اب سیٹھ جی روتے پیٹتے لوٹے اور کہنے لگا ہائے وہ کیا یہ دگا دیگیا	سو نکد اور دو کی جنس گھر سو جھپٹ لے گیا

جب خوب رو پیٹ چکے تو کھونٹی پر الو بٹھا دیا اور آپ دوکان پر بیٹھ گئے کوئی کچھ لینے آتا تو نہایت ہی متانت سے فرماتے،

سانچ تھا میری بات لینے پچھ بھی تو ہے	سب ہے دیا رام کی یہی ہر الو بھی ہے

یہ نقل بیان کر کے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ کسی نے باز معانی بتا کر فدوی کو بھی الو دیدیا ہے اور یہ ایک عطار کی دوکاں پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتے ہیں جب کوئی شخص کچھ خریدنے عطار کی دوکان پر جاتا ہے تو بنئے کی طرح عطار کہتا ہے	وہ بھی ہے فدوی بھی ہے۔

اور پھر اپنے ایک شعر کے سرقہ کا تذکرہ اور اس سرقہ شدہ مضمون کو غلط باندھنے کا قصہ کہا ہے۔ غرض یہ مثنوی ہجویہ ہے مگر ہے بہت دلچسپ اور کسی قدر مہذب بھی ہے گو ہجو کی ہے مگر صرف فدوی کو الو بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا یہ بھی غنیمت ہے ورنہ "غنچہ" کو پکار کر قلمدان منگوانے کے بعد مرزا صاحب کہیں رک سکتے تھے یہ (۱۰۹) شعر کی مثنوی ہے جو آخری ہے

ہم صرف مرزا صاحب کی مثنویوں کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے مگر مثنوی کی بحر میں ہونے کی وجہ سے انکی ہجو کو بھی لینا پڑا انشاء اللہ آئندہ کبھی "ہجویات اور سودا" پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائیگی۔ گو مرزا سودا نے صنف مثنوی میں کوئی خاص بات پیدا نہیں کی مگر ان کی مثنویاں اس قدر خراب بھی نہیں ہیں جیسی کہ عام طور پر خیال کی جاتی ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ان آقایان اردو پر تنقیدی نظر ڈالیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ ان سے جو کچھ بھی ملے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔

تمکین کاظمی

تصویر زیب النسا بیگم

یہ تصویر صنعت و نقاشی کا ایک نادر نمونہ ہے رنگین آرٹ پیپر پر طیار کرائی گئی ہے۔ یہ وہی تصویر ہے جسکو حکومت ہند نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے برٹش میوزیم کو دیا ہے۔ نہایت عجیب چیز ہے قیمت مع محصول ۸/

مینیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور مصور مزمدار کے قلم کی بہترین صناعی ہے۔ یہ تصویر بھی رنگین آرٹ پیپر پر طبع کرائی گئی ہے۔ اور یہ تصویر نگار ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہو چکی ہے آپ دیکھیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے۔

قیمت فی کاپی علاوہ محصول ۴/

مینیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

بڑھیا عطر صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائے

؟

(فشا)

(۱)

مجھے بمبئی آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ زر نقد انحطاط پذیر تھا۔ میری تمام پونجی ختم ہو چکی تھی اسوقت میرے پاس سو روپیہ کا صرف ایک نوٹ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ بمبئی جیسے شہر میں اس قلیل رقم کی کوئی حقیقت نہیں اور ہنوز مجھے اپنی امید کے بر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی اس کے علاوہ ہوٹل کے اخراجات ادا نہیں کئے گئے تھے۔ آج ہفتہ کا آخری روز تھا اور اس کا حساب صاف کرنا لازم۔ یہ خیالات میرے دل میں گزر رہے تھے کہ ہوٹل کے ملازم نے دستک دی اور طشتری پر ایک کاغذ پیش کیا۔ یہ میرے اخراجات کا بل تھا کل ۹۷ روپیہ ہوتے تھے میں نے نوٹ نکال کر رکھدیا اور کچھ دیر بعد ہی ملازم تین روپیہ مجھے واپس کر گیا۔ میں حیران و پریشان تھا۔ اگر آج بھی ملازمت کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں موت کو گداگری پر ترجیح دونگا۔ یہ خیال کر کے اُٹھا۔ اور وکٹوریہ ٹرمنس کی طرف چلدیا وہاں میرے والد مرحوم کے ایک عزیز دوست جی آئی پی ریلوے کے افسر اعلیٰ تھے اور قوی امید تھی کہ وہ مجھے اس کشمکش سے ضرور نجات دلائینگے۔ ۹ بجے کا وقت انھوں نے ملاقات کیواسطے مقرر کیا تھا۔ ۹ بجنے میں دس منٹ کی دیر تھی میں اسٹیشن پر پہونچ گیا اور وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔ مگر انتظار میرے واسطے بے سود تھا۔ کیونکہ اسیوقت مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر گنس آدھ گھنٹہ قبل نہایت ضروری کام سے بھساول جا چکے ہیں۔ اور دو ایک روز تک ان کا آنا محال ہے۔

دنیا میرے واسطے تاریک ہو گئی۔ میری آخری امید منقطع ہو چکی تھی میں لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور ایک سمت چلدیا میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر بمبئی کے بازاروں میں گشت لگاتا رہا مگر جسوقت ہوش آیا تو اپنے ہوٹل کے سامنے تھا میں تیزی کے ساتھ اوپر چڑھ گیا اور کمرہ میں پہونچکر دیوانوں کے مثل پلنگ پر گر گیا۔ چاہتا تھا کہ نیند آجائے مگر پریشان حالی میں وہ بھی نہیں آتی۔ پریشان کن خیالات دماغ میں ہجوم کئے ہوئے تھے۔ اسکیمیں مرتب کرتا تھا اور بگاڑ دیتا تھا میں اس قدر محو تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز تک نہ سنی۔ ملازم کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اندر آیا اور ایک کارڈ مجھے دیا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ اس نے بڑھکر بٹن دبایا اور روشنی کر دی۔ میں نے کارڈ پر نظر ڈالی۔

احمد مرزا

روح حنا صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ایک مرتبہ منگا کر استعمال کیجئے

"کون احمد مرزا؟ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں۔ اچھا بلاؤ۔"

ایک لمحہ بعد ایک پستہ قد مگر جسیم آدمی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور کہنے لگا "کیا مجھے مسٹر رفیق احمد سے خطاب کا فخر حاصل ہے؟"

"بندہ ہی کو رفیق احمد کہتے ہیں۔ فرمائیے کیسے تکلیف کی؟"

"مجھے کچھ دیر آپ سے تخلیہ میں گفتگو کرنا ہے۔ زحمت ہوگی۔ معاف کیجئے۔"

"فرمائیے۔ فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔"

"میں آپ کو زیادہ تکلیف نہ دونگا اور مختصراً یہ عرض کرنے کی جراءت کرونگا کہ مجھے آپ کی خدمات کی چند گھنٹوں کے واسطے ضرورت ہے اس تکلیف کے معاوضہ میں آپ جس قدر روپیہ طلب کریں گے ادا کیا جائیگا۔ کیا پانچسو روپیہ فی گھنٹہ آپ کو منظور ہے؟"

"مگر مجھے کام کی نوعیت معلوم ہونی چاہئے۔ اسوقت میں آپ کو بتا سکونگا کہ مجھے آپ کی خدمت کا فخر حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ نوعیت کے متعلق میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ کوئی بات آپ کے ضمیر کے خلاف نہیں ہوگی۔ ہمیں آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے میں کل صبح آٹھ بجے پھر حاضر ہونگا۔ اُمید ہے اسوقت تک آپ میری درخواست پر کافی غور فرمالیں گے اور اسے رد نہ کیا جائیگا۔"

میں ابھی کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور السلام علیکم کہکر کمرے کے باہر تھا۔ "پانچسو روپیہ فی گھنٹہ" یہ شیریں الفاظ میرے کانوں میں ابتک گونج رہے تھے۔ اس قدر رقم کوئی شخص ایک گھنٹہ کے واسطے نہیں دیسکتا۔ جب تک کہ کسی کی جان ہی پر نہ بنی ہو ——— ضرور کوئی خطرناک کام ہے۔ میں اسکو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مگر نہیں۔ اگر اسکی درخواست کو منظور نہ کیا تو کل ہی سڑک کی پٹری پر پڑا ہوا نظر آؤنگا اس کے سوا نی الحال کوئی چارہ کار نہیں۔ یا الٰہی! مجھے کیا کرنا چاہئے۔ خیر صبح دیکھا جائیگا میں پلنگ پر لیٹ گیا اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انھیں خیالات میں محو ہو کر سو گیا۔

(۲)

ٹھیک آٹھ بجے میرا اجنبی ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اس کی درخواست کو منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بغیر کسی قسم کی رسمیات کے اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔

"میں آپ کی عنایت کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ مجھے امید تھی کہ آپ میری درخواست کو نہ ٹھکرائینگے۔ پس تو اب بسم اللہ کیجئے۔ جسقدر جلد کام شروع ہو جائے بہتر ہے۔ میرا موٹر نیچے موجود ہے۔"

اجنبی اور میں موٹر میں سوار ہو گئے۔ قریب آدھ گھنٹہ کا سفر تھا۔ آخر کار موٹر ایک عالیشان مکان کے سامنے رکا ہم اندر داخل ہوئے میرا ہمراہی مجھے ایک کمرہ میں چھوڑ کر خود کا غذات لینے کیواسطے باہر چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا تھا اور خیالات میں محو کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا

حبشہ عطر سفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کرنا چاہئے

کہ کمرہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا ہے میری حیرت کی انتہا نہ تھی ' میرا دل خود بخود بیٹھا جا رہا تھا۔ یہ مکان مجھے طلسم خانہ معلوم ہوتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا مگر وہ مقفل تھا۔ لیکن اگر کھلا بھی ہوتا تو میں اسوقت کس طرح نکل سکتا تھا بہرحال اب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ مگر کیوں ؟ میں نے اکتا کیا بگاڑا تھا

کمرہ کم از کم پچیس فٹ کی بلندی پر پہونچکر ٹھہر گیا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ دروازہ ایک اور کمرے میں جاتا تھا رہائی پانے کی امید میں اس کی طرف بڑھا۔ مگر چند ہی قدم گیا ہونگا کہ ایک عجیب و غریب نظارہ نے ہاتھ پیر پھلا دئے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں مثل بید کے جنبش کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوعمر لڑکی جس کی عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی کمرے کے درمیان میں فرش پر پڑی ہے۔ ہاتھ پیر بندھے ہیں۔ اور ظاہرا بیہوش ہے میں اُس کے قریب گیا اور غور سے دیکھا۔ وہ نہایت بیش قیمت لباس پہنے ہوے تھی۔ مجھے معاملہ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اور صاف نظر آنے لگا کہ یہ جرائم پیشہ اشخاص کی قیام گاہ ہے جو اس غریب لڑکی کو کہیں سے پکڑ لائے ہوں گے۔ زیور وغیرہ اتار کر یہاں قتل کرنے کے واسطے ڈال دیا ہے۔ اتفاق تھا کہ میں اس موقع پر پہونچ گیا۔ ہرچہ بادا باد۔ میں اس کے بچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرونگا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے میں نے اس کے بند کھولنے شروع کئے۔ دونوں ہاتھ مشکل سے کھول پایا تھا کہ پشت پر ایک عجیب آواز سنائی دی مڑ کر دیکھا تو ایک سیاہ زہریلا سانپ پھن اٹھائے ہوئے چلا آرہا ہے یہ دہشت خیز نظارہ دیکھکر میرے حواس بجا نہ رہے جس خوفناک طریقہ سے یہ بے رحم اسکو قتل کرنا چاہتے تھے اس کا نقشہ میری آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ میں کانپ اٹھا۔ اور تہیہ کر لیا کہ ہر ممکن طریقہ سے موت کے منہ میں جاتے سے اسے بچاؤں گا اس کمرے میں فرنیچر کی قسم سے کوئی چیز نہ تھی مگر جس کمرے سے میں آیا تھا وہ ہر طرح سے آراستہ تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اسے اُٹھا کر جس طرح ممکن ہو کوچ پر پہونچا دینا چاہئے۔ میں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور لڑکی کو اُٹھا کر تیزی کے ساتھ کوچ کیطرف بڑھا سانپ بہت نزدیک آگیا تھا۔ مگر پھر بھی جوں توں کر کے کوچ تک پہونچ گیا اور اس کو احتیاط کے ساتھ لٹا دیا۔ سانپ اب بالکل میرے قریب تھا کمرے میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے میں اس کا مقابلہ کرتا اور نہ اس کی مہلت تھی۔ آخر کار وہ میرے پیروں سے چمٹ گیا بہت ہاتھ پیر مارے مگر اس موذی جانور سے چھٹکارا ناممکن تھا۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا موت میرے سامنے تھی۔ آخر کار میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

(۳)

جسوقت آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرہ میں تھا۔ میرے غصہ کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسی اجنبی مسٹر احمد مرزا کو اپنے سامنے پایا۔ وہ کہہ رہا تھا "مسٹر رفیق"۔ میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس قدر تکلیف گوارا فرما کر ہمیں بیش بہا امداد پہونچائی۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ ہم یہاں سے آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ اسوقت دس کا عمل ہے۔ گویا دو گھنٹہ صرف ہوے۔ یہ سو سو روپیہ کے دس نوٹ معاوضہ میں قبول فرما کر شکر گزاری کا موقع دیجئے"۔

میں بہت ضبط کر چکا تھا۔ معاملہ حد کو پہونچ گیا تھا۔ میں پلنگ سے کود پڑا اور ٹیلیفون کی طرف جھپٹا۔ گھنٹی بجائی اور کہا۔

صفدر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ میں بہت بڑا کارخانہ ہے

"تھانہ سے ملا دو جلدی کرو۔"

احمد مرزا" جناب والا۔ آخر یہ وحشت کیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آرام فرمائیے ابھی کمزوری باقی ہے۔"

"معاف کیجئے۔ مذاق بہت ہو چکا۔ میں نے آپ کی جائے قیام کی حقیقت معلوم کر لی ہے۔ آپ نہایت خطرناک مجرم ہیں اور میں آپ کو پولس کے حوالہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کرونگا۔ ایک بے گناہ لڑکی کو جکڑ کر باندھ دینا اور نہایت دردناک طریقہ سے قتل کرنے کی کوشش کرنا تاکہ ارتکاب جرم کا پتہ نہ چلے اور یہی معلوم ہو کہ سانپ کے کاٹنے سے مری ہے۔ آپ کے نزدیک خفیف سی بات ہوگی مگر میں حقیقت سے واقف ہوں۔ اور تمام واقعات من وعن پولس کے سامنے بیان کر دونگا۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ میں نے آلہ ہاتھ میں لیا۔ مختصراً تمام واقعات بیان کئے اور جلد آنے کے واسطے کہا۔ یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں مگر اجنبی کے چہرے پر مطلق پریشانی کے آثار نہ تھے وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ گویا وہ اس کو مضحکہ انگیز بات خیال کر رہا ہے۔

"اب آپ اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ آئیے اپنا تعارف کرا دوں۔ اسوقت تک آپ مجھ کو احمد مرزا کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ کارڈ ملاحظہ ہو

بیر بھائی۔ پروپرائٹر انڈین فلم کمپنی۔ بمبئی

مجھے حیرت تھی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کل ایک شخص "احمد مرزا کے لقب" سے آکر مجھ سے ملتا ہے اور دو گھنٹے کے واسطے ایک ہزار کی کثیر رقم دینے کے واسطے آمادہ ہے میں اس کے ہمراہ اس کے مکان پر جاتا ہوں اور وہاں عجیب وغریب واقعات کا مشاہدہ کرتا ہوں بیہوش ہونے کے بعد اپنے کو پھر ہوٹل میں پاتا ہوں اور وہی اجنبی میرے سامنے ہے۔ لیکن اسوقت وہ اپنے کو ہندوستان کی مشہور فلم کمپنی کا مالک ظاہر کرتا ہے۔ آخر یہ اسرار ہے تو کیا ہے۔ مجھے حیرت میں دیکھکر وہ ہنسا اور کہنے لگا" آخر آپ یقین کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ پچھلے چند گھنٹے کے واقعات کو صحیح تصور کرتے ہیں خیال تو کیجئے۔ وہ واقعات کسی ڈرامے کے ایک حصہ کے واسطے کس قدر موزوں ہیں اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ ہمارا ایک ایکٹر دو ہفتہ ہوئے یکایک انتقال کر گیا وہ حال ہی میں ایک ڈرامہ پورا کر چکا تھا جسوقت فلم دھوئی گئی تو ہماری ناکامی کی انتہا نہ تھی۔ فلم کا وہ حصہ جو تمام ڈرامے کی جان تھا نہایت دھندلا تھا ہم فلم کو اس حالت میں کبھی کام میں نہیں لا سکتے تھے اُس کا کیس کو بھی بچانا بس ضروری تھا۔ دو ہفتہ سے ہم حیران وسرگرداں کسی ایسے شخص کی جستجو میں تھے جو ہمارے مرحوم ایکٹر کی شکل سے مشابہت رکھتا ہو کل میرے ایک ایجنٹ نے آپ کو کوٹھہ ٹرنس سے نکلتے ہوئے دیکھا آپ کی شکل ہمارے ایکٹر سے بہت مشابہت رکھتی ہے مجھے اطلاع ہوئی میں فوراً آپ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کی امداد کا

عطر خس کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کیجئے

طلبگار۔ بڑی خوش قسمتی تھی کہ آپ نے میری درخواست کو قابل پذیرائی تصور فرمایا۔ اصل واقعہ سے اگر آپ کو مطلع کر دیا جاتا تو آپکی حرکات و سکنات میں وہ پھرتی ہر گز نہ پائی جاتی جسکا آپ نے ابھی دو گھنٹہ قبل اظہار کیا اور پھر یہ تمام باتیں بناوٹی دکھائی دیتیں اسکو پوشیدہ رکھکر ہمنے آپ کو مجبور کیا کہ آپ اس طرح عمل کریں گویا تمام باتیں در اصل پیش آ رہی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بالکل خوف زدہ ہوگئے اور بالکل ہماری خواہشات کے مطابق عمل کیا۔ حقیقتاً آپ کو بے حد تکلیف ہوئی۔ جس کی میں معافی چاہتا ہوں اور یہ ناچیز نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ اور ہاں اگر آپ اپنے کو فلم میں دیکھکر حظ اٹھانا چاہتے ہیں تو کل شام بمبی پکچر پیلس میں تشریف لائیے"۔

"مگر وہ سانپ! وہ تو جاندار تھا؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے قہقہہ لگایا "آپ اسی دہوکے میں آگئے۔ وہ سانپ یہ ہے دیکھئے بالکل مصنوعی ہے اور میری حال ہی کی ایجاد۔ اسمیں یہ چھوٹا سا انجن کہربائی قوت پیدا کرتا ہے اور جب مشین حرکت میں آتی ہے تو بالکل اصلی سانپ کی طرح چلتا ہے۔ مگر دیکھئے ربڑ کا بنا ہوا ہے"۔

میرے تمام شکوک رفع ہوگئے۔ مگر اب زینہ پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک سارجنٹ کمرہ میں داخل ہوا میں نے اس سے بہت بہت معافی مانگی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور وہ بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر گیا۔

"آپ نہایت عقلمند ہیں" میرے ساتھی نے کہا "اچھا کیا۔ سارجنٹ کو واپس کر دیا۔ مفت میں مجھے اور آپ کو زحمت ہوتی۔ مگر قبل اس کے کہ میں آپ سے رخصت ہوں ایک درخواست کرونگا کہ آپ ہمارے مرحوم ایکٹر کی جگہ مستقلاً کام کیجئے۔ ایکہزار روپیہ ماہوار آپکی تنخواہ ہوگی۔ فرمائیے منظور ہے"۔

....

اور کیا آپ بہرام، کے نام سے واقف نہیں؟

حفیظ الرحمن

جذبات بھاشا

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اردو میں صرف جذبات بھاشا ہی وہ کتاب ہے جسمیں ہندی شاعری کے نادر او جود اور بیمثل نمونے مل سکتے ہیں اور جسے حضرت نیاز فتحپوری نے ۱۹۱۲ء میں مرتب کیا تھا اس کی قیمت علاوہ محصول ۱۲ ہے لیکن آپ کو مفت مل سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ آپ نگار کا سالانہ چندہ مع محصول صہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدیجئے اور اس کتاب کو حاصل کر لیجئے اگر آپ نگار کے پرانے خریدار ہیں اور آپ کا چندہ ختم ہو رہا ہے تو آپ بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ چندہ ختم ہونے پر رعایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ صرف جذبات بھاشا علیحدہ خرید کرنا چاہیں گے ان سے مع محصول عہ قیمت لی جائیگی

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

بہترین عطر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

علم فراست الید

یا

سمدرک

(گزشتہ سے پیوستہ)

شمسی لکیر اس لکیر کو کامیابی کی لکیر بھی کہتے ہیں اور اس کا ذکر مختصراً گزشتہ ماہ کے رسالے میں بھی آچکا ہے کہ جب تک یہ لکیر اچھی نہ ہو، قسمت کی لکیر کا اچھا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور دنیا میں کامیابی مشکل ہے خواہ ایک شخص اپنے ذہنی اکتسابات اور دماغی کمالات کے لحاظ سے کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ برخلاف اس کے اگر یہ لکیر اچھی ہو تو ایک شخص شہرت، اقتدار، دولت، عزت سبھی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ یہ لکیر ہات میں کس جگہ پائی جاتی ہے۔ اس لکیر کی اصل جگہ (۱-۱) سے ظاہر ہوگی، لیکن یہ لکیر مختلف مقامات سے پیدا ہو سکتی ہے یعنی

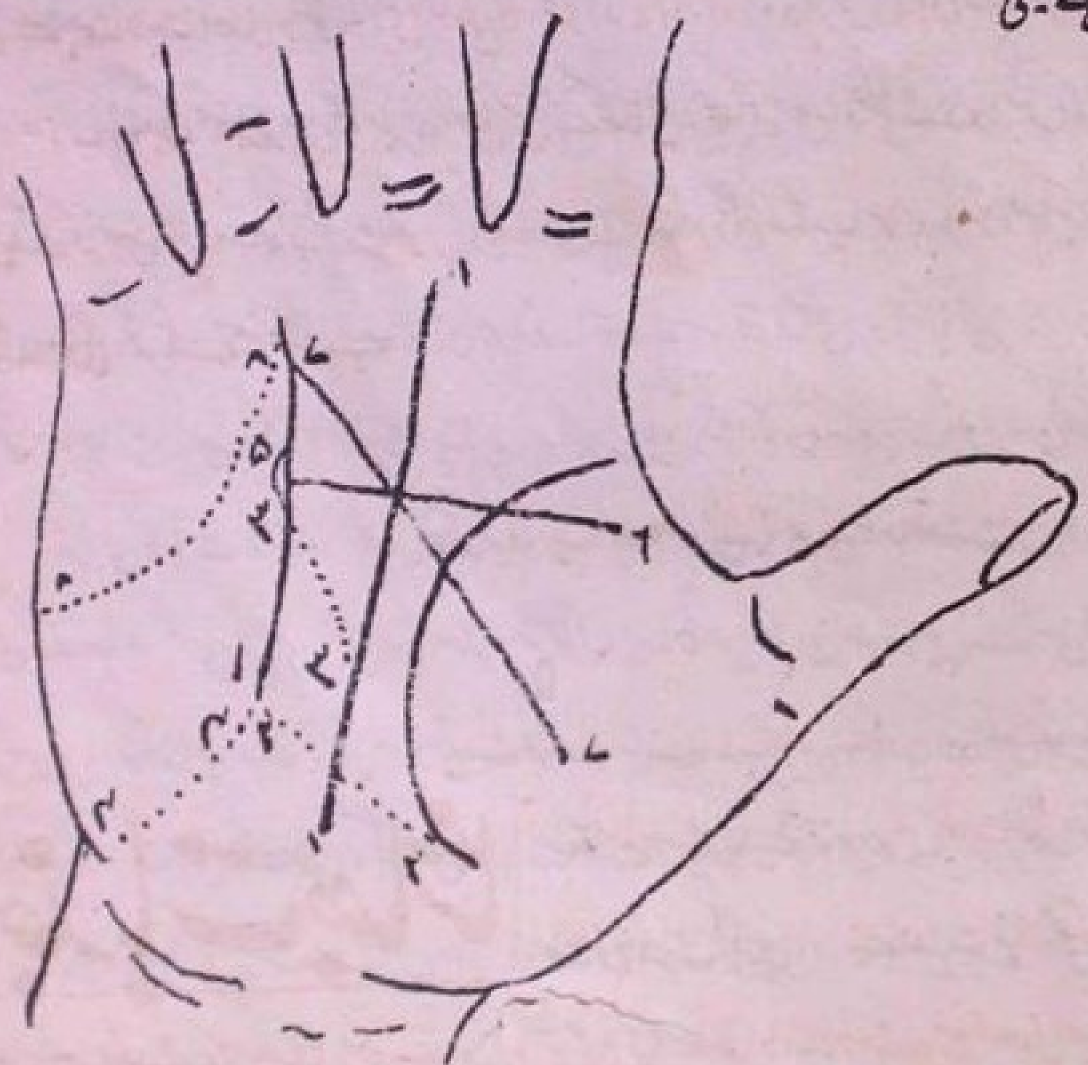

زندگی کی لکیر سے، مریخ کے ابھار سے چاند کے ابھار سے، دماغی لکیر سے قلب کی لکیر سے اور کبھی وہ خود اپنے ہی ابھار میں مختصر سی نظر آتی ہے اور کسی دوسرے ابھار یا خط سے پیدا نہیں ہوتی۔

اگر یہ عمر کی لکیر سے نکلی ہو جیسا کہ (۲-۲) سے ظاہر ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص اپنے باپ دادا کی طرف سے کامیابی کے ذرائع ساتھ لایا ہے، خود اس کی سعی و کوشش کو زیادہ دخل نہیں ہے۔

اگر یہ لکیر قسمت کی لکیر سے پیدا ہوئی ہو جیسا کہ (۳-۳) سے ظاہر کیا گیا ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اس شخص کی کامیابی دنیا میں یقینی ہے

ایمانداری کا ذریعہ ترقی ہے۔ کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ

جو خود اسی کی کوشش سے حاصل ہوگی۔ اگر یہ لکیر مریخ کے اُبھار سے پیدا ہو کر تنہا بغیر کسی اور لکیر سے ملی ہوئی چلی گئی ہو جیسا کہ (۸-۸) سے ظاہر ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی بہت مشکل سے حاصل ہوگی۔ اگر اس لکیر کی ابتدا چاند کے اُبھار سے ہوگی جیسا کہ (۴-۴) سے بتایا گیا ہے تو ظاہر ہوگا کہ ایسے شخص کی کامیابی کسی دوسرے کی امداد و مرضی پر منحصر ہوگی اور پائدار نہ ہوگی۔ چنانچہ ایکٹروں، مقرروں، واعظوں اور مصوروں وغیرہ کے ہات میں ایسی لکیر کا ہونا ان کی کامیابی کی دلیل ہے

اگر یہ لکیر، دماغی لکیر سے پیدا ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص خود اپنی دماغی محنت و قابلیت سے ترقی حاصل کریگا لیکن عمر کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد یہ لکیر مصنفوں اور دوسرے دماغی کام کرنے والوں کے ہات میں اکثر پائی جاتی ہے

اگر یہ لکیر قلب کی لکیر سے نکلی ہو تو معلوم ہوگا کہ کامیابی ادھیڑ عمر میں ہوگی اور کسی قلبی تعلق کی بنا پر ایسی لکیر والا اخیر عمر میں کامیاب شادی کریگا جو آرام و سکون کا باعث ہوگی۔

اگر یہ لکیر اپنی ہی اُبھار میں نظر آئے اور کسی اور لکیر سے نہ پیدا ہوئی ہو تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کا زمانہ بالکل آخری عمر میں آئیگا اور جسکا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

اگر ہات کی تیسری اونگلی (جو شمسی اونگلی کہلاتی ہے) پہلی اونگلی سے لانبی ہو اور شمسی لکیر بھی نمایاں ہو تو سمجھا جائیگا کہ ایسے شخص میں قمار بازی کا جذبہ قوی ہے۔ اگر یہ انگلی بیچ کی اونگلی کے برابر ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ایسے شخص میں دولت جمع کرنے کی حرص بہت قوی ہے۔ اگر تیسری اونگلی بہت لانبی ہو اور اسی کے ساتھ اینٹھی ہوئی یا ٹیڑھی ہو تو ثابت ہوگا کہ ایسا شخص روپیہ حاصل کرنے میں جائز و ناجائز ذریعہ سے کام لیگا۔ چنانچہ چوروں اور قزاقوں کے ہات میں اس قسم کی اونگلی اکثر پائی جاتی ہے۔

اگر کسی کا ہات لانبا اور انگلیاں نوکدار ہوں (جو مخروطی ہات کی خصوصیات ہیں اور جس کا ذکر اپریل ۱۹۲۷ء کے نگار میں آچکا ہے) اور اسی کے ساتھ شمسی لکیر بھی اچھی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص فنون لطیفہ میں سے کسی فن کے ماہر ہونے کی حیثیت سے کامیابی حاصل کریگا لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہر جنھیں نائک کہتے ہیں اُن کا ہات مخروطی نہیں ہوتا بلکہ چوکور ہوتا ہے جسے فلسفیانہ ہات بھی کہتے ہیں۔ اگر کسی کا ہات بہت زیادہ لانبا اور مخروطی ہو تو پھر شمسی لکیر کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ ایسے آدمی بہت زیادہ خیال پرست ہوتے ہیں۔ اور دولت و شہرت وغیرہ کی پروا نہیں کرتے۔ اُن کی زندگی خواب کی طرح بسر ہوجاتی ہے اور وہ اسی میں خوش رہتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی ہات میں شمسی لکیر کا پایا جانا اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ایسا آدمی اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لکیر زیادہ تر آرٹ پسند فطرت کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ایسے لوگ حسن پسند اور نفاست پسند ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہات میں یہ لکیر نہیں ہوتی وہ ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور ہر حال میں خوش زندگی گزار دیتے ہیں۔

کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے نفیس عطر منگائیے اور نقلی سے بچیئے

اگر شمس کے ابھار میں بہت سی لکیریں پائی جائیں گی تو مقاصد کی کثرت اور اغراض کے تنوع ظاہر ہوگا اور ایسی صورت میں جیسی کامیابی ہونی چاہئے نہیں ہو سکتی

اگر شمسی لکیر دو تین متوازی پائی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایک سے زاید صورتیں حصول دولت کے پیدا ہونگی

اس لکیر میں جزیرہ کا پایا جانا اچھی علامت نہیں ہے (ملاحظہ ہو نشان نمبر ۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص زمانہ میں اس کی بدنامی ہوگی۔ اگر انگوٹھے کی طرف سے لکیریں آکر اس کو قطع کریں یا مریخ کے اُبھار سے کوئی خط آکر اس سے ملے (ملاحظہ ہو ۶-۶) تو اس کو بُری علامت سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوگا کہ لوگ اس سے حسد رکھیں گے اور مقصد کے حصول میں حائج ہوں گے۔ اگر زہرہ کے اُبھار سے کوئی خط آکر اس سے ملیگا تو معلوم ہوگا کہ وہ حرج پیدا کرنے والی ہستی کسی عورت کی ہوگی (نشان ۷-۷)

اس لکیر پر کسی ستارہ کا پایا جانا نہایت عمدہ علامت ہے۔ صلیبی نشانات کا ہونا مشکلوں اور دقتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

گہری ہتیلی میں یہ خط بالکل بے معنی چیز ہے

قلب کی لکیر

قلب کی لکیر کی جاے وقوع ذیل کے نقشے میں (۱-۱) سے معلوم ہوگی۔ یہ لکیر انسان کی تعلق قلبی کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی اس سے معاملات محبت میں دماغی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

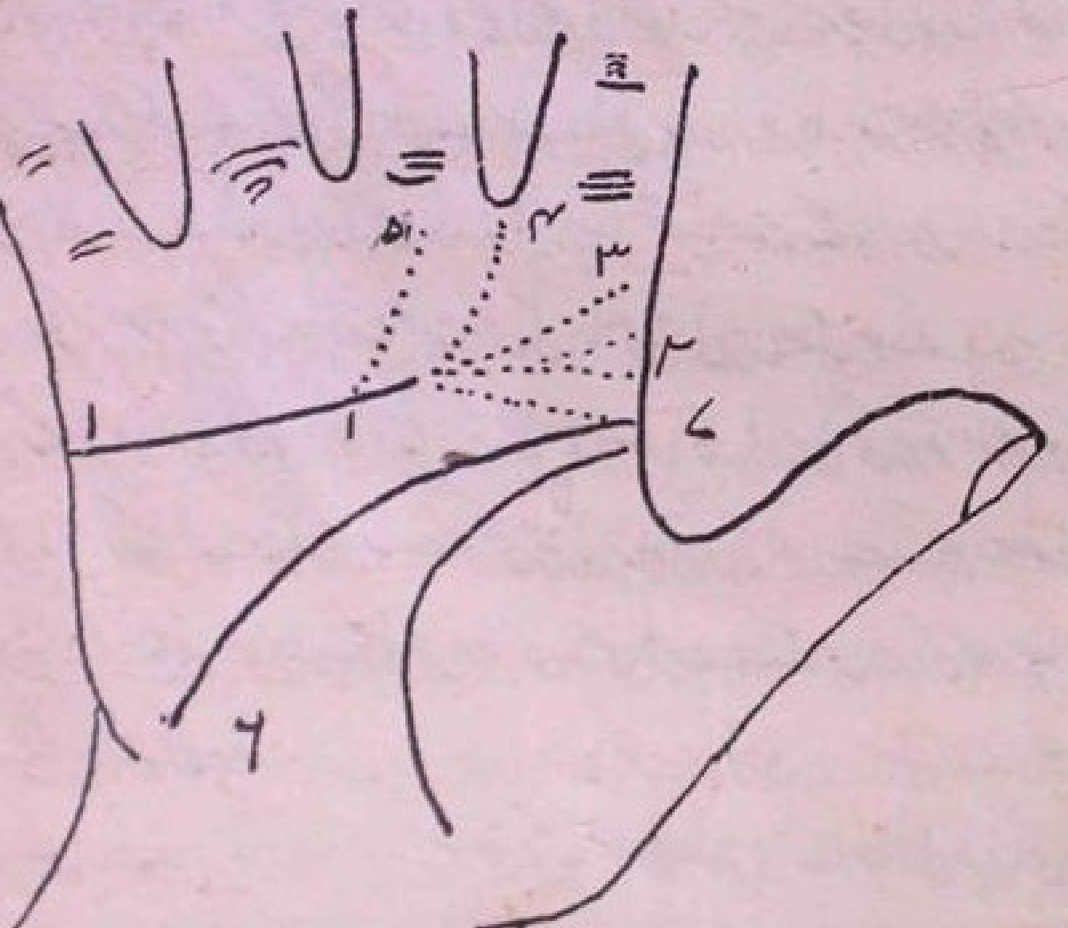

اس لکیر کو گہرا اور خوشرنگ ہونا چاہئے

یہ لکیر کبھی تو مشتری کے انتہی ابھار سے نکلتی ہے (ملاحظہ ہو نشان ۲) اور کبھی اس کے وسط سے (نشان نمبر ۳) کبھی پہلی دوسری انگلی کے درمیان پیدا ہوتی ہے (نشان نمبر ۴) اور کبھی زحل کے اُبھار سے (نشان نمبر ۵)

مشتری کے انتہی ابھار سے اس کا رونما ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ایسا شخص محبت کے معاملہ میں بالکل اندھا ہے اور اپنے جوش میں پس و پیش کچھ نہیں سوچتا لیکن اگر اس کے وسط سے پیدا ہوگی تو اس کیفیت اور جوش میں اعتدال ہو جائیگا۔ ایسے لوگ اپنی محبت میں قابل اعتماد اور استوار ہوتے ہیں اخلاق اور عزت کا خیال بھی اُن کے سامنے ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے سے کمتر درجے کے لوگوں میں

عطر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

شادی نہیں کرتے اور نہ کثرت ازدواج کو اچھا سمجھتے ہیں۔

پہلی دوسری اونگلی کے درمیان سے اس لکیر کا ظاہر ہونا معاملات محبت میں نہایت گہری فطرت کو ظاہر کرتا ہے، یعنی یہ بہت سوچ سمجھکر محبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ تباہ نہیں کر دیتے۔ لیکن اگر کوئی خاص ہستی ان کو ملجاتی ہے تو وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ لکیر زحل کے ابھار سے نکلی ہوگی تو خود غرضی ظاہر ہوگی۔ ایسے لوگ اپنے محبوب کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اُٹھا رکھتے۔ لیکن اس کے ملجانے کے بعد کچھ زیادہ قدر بھی نہیں کرتے اور محبوب کی ذرا سی غلطی یا فروگزاشت کو بھی معاف نہیں کرتے۔

اگر یہ لکیر زحل کے ابھار کے بالکل نیچے سے شروع ہوتی ہے (نشان ۸ - ۱) تو یہی خصوصیات جو ابھی بیان ہوئے ہیں بہت زیادہ نمایاں ہوجائیں گے۔ ایسے لوگ صرف اپنی ہی خاطر جیتے ہیں اور اپنی متعلقین کی پروا نہیں کرتے۔ قلب کی لکیر جسقدر مختصر ہوگی اسی قدر احساس محبت کم ہوگا اور اگر یہ لکیر بہت لانبی ہوگی (نشان نمبر ۲) تو ضرورت سے زیادہ رشک کو ظاہر کرے گی۔ اور اگر اسی کے ساتھ دماغی لکیر چاند کے اُبھار تک جاتی ہوئی نظر آئے (ملاحظہ ہو نشان نمبر ۲) تو سمجھ لینا چاہئے کہ رشک کے ساتھ کڑھنے اور اندر ہی اندر گھلنے کا بھی قوی جذبہ موجود ہے

اگر قلب کی لکیر خم کھاکر مشتری کے اُبھار کے بالکل نیچے نیچے چلی گئی ہو (نشان نمبر ۷) تو سمجھا جائے گا کہ معاملات محبت میں اس کو بہت ناکامیاں ہونگی۔ ایسے لوگ عشق و محبت کے معاملات میں بہت منکسر مزاج ہوتے ہیں اور اپنے سے کم درجہ کے لوگوں میں آسانی سے شادی کر سکتے ہیں۔ اگر لکیر زنجیر دار ہو یا چھوٹی چھوٹی لکیریں اسمیں سے پھوٹی ہوں تو سمجھا جائے گا کہ ایسے شخص کی محبت کو قیام نہیں ہے اور وہ ہر جگہ محبت کر سکتا ہے۔ اگر یہ لکیر زحل کے ابھار سے نکلی ہو اور زنجیر دار ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا انسان جنس مقابل کی طرف سے نفرت رکھتا ہے

اگر یہ لکیر چوڑی اور زرد رنگ کی ہو تو سمجھا جائے گا کہ ایسا شخص محبت کے باب میں نہایت سطحی جذبات رکھتا ہے۔ اگر یہ لکیر، دماغی لکیر تک چلی گئی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ معاملات محبت اس کی دماغی ترقی میں حائل ہونگے

اگر یہ لکیر سراسر چلی گئی ہو اور دماغ کی لکیر بھی اس سے بالکل ملی ہوئی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص اگر کسی چیز کی طرف مائل ہوتا ہے تو دل و دماغ دونوں کی قوتیں صرف کر ڈالتا ہے اور کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسے لوگ بہت خوددار اور ایک حد تک خطرناک بھی ہوتے ہیں کیونکہ اگر ایک مرتبہ ان کو برہم کر دیا جائے تو پھر وہ خونخوار بھی ثابت ہوتے ہیں اور اُن کا احساس اسقدر قوی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

اگر اس لکیر کی ابتدا دوشاخہ سے ہو یعنی ایک شاخ مشتری کے ابھار کی طرف گئی ہو اور دوسری شاخ پہلی دوسری اونگلی کے درمیان چلی گئی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص بہت معتدل ہے اور معاملات محبت میں وہ بہت خوش نصیب ثابت ہوگا۔

اگر یہ لکیر کسی کے ہات میں نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بہت بے حس و ظالم ہے اور اگر اس کے ساتھ زہرہ کا ابھار اچھا ہوگا تو معلوم معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہوت پرست ہے۔

ایک مرتبہ کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی سچائی کا امتحان کیجئے

صحت کی لکیر

اس لکیر کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اس میں اختلاف ہے لیکن کیرو کا تجربہ یہ ہے کہ وہ عطارد کے ابھار سے یا اس کے نیچے سے شروع ہوتی ہے۔ (نشان ۱-۱-۱) اور عمر کی لکیر کی طرف بڑھ کر اس کو قطع کرتی ہے یہ مقام انقطاع گویا ہلاکت کا نقطہ ہے

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عمر کی لکیر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر خارجی اسباب پیدا نہ ہوں تو ایک شخص کی عمر اتنی ہونی چاہئے، لیکن صحت کی لکیر سے بیماریوں وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہانتک کہ وہ عمر کی لکیر کو قطع کر دے کہ یہی وقت اختتام عمر کا ہے خواہ عمر کی لکیر آگے ہی کیوں نہ گزر جائے۔ (نشان نمبر ۲)

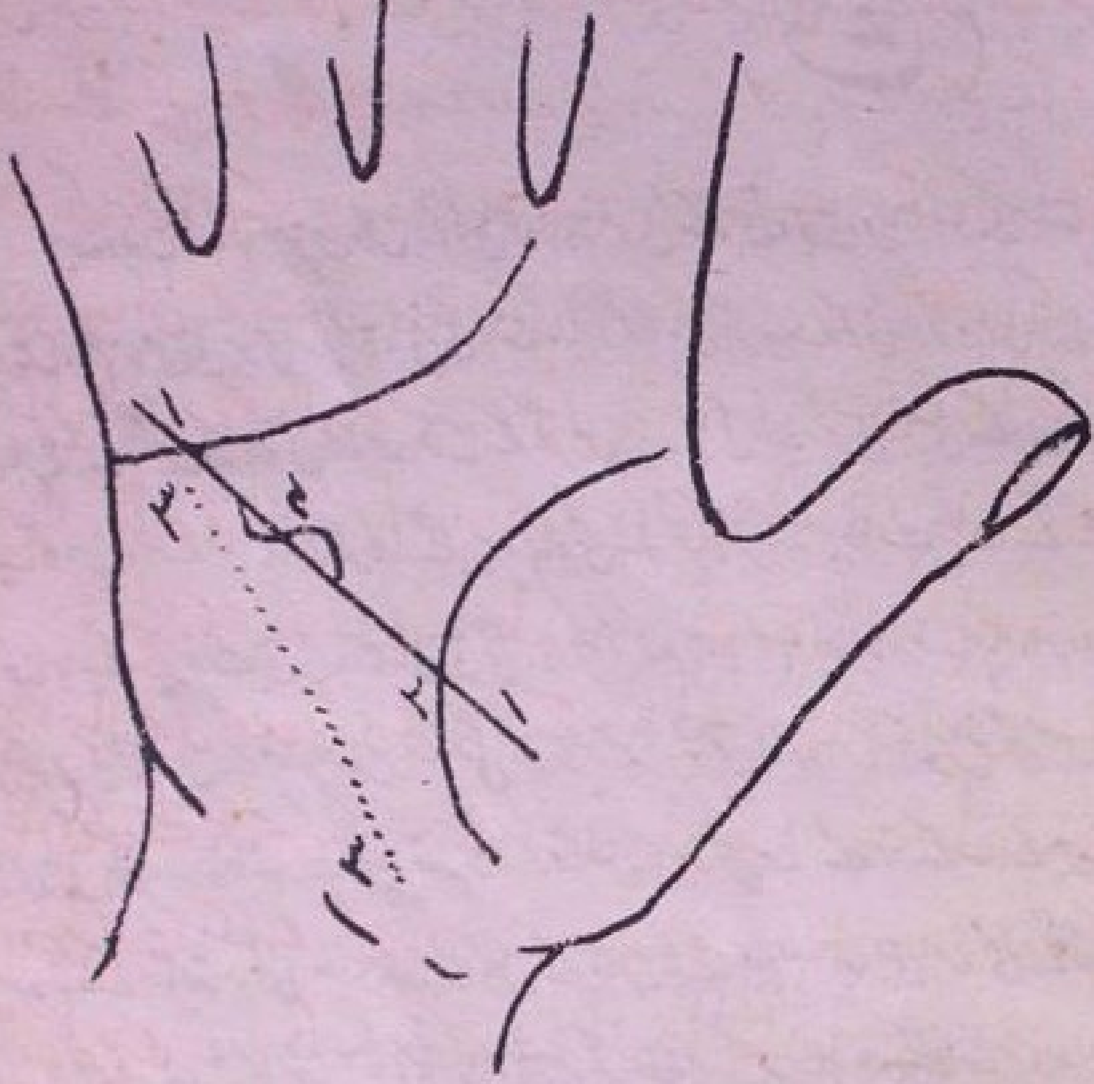

صحت کی لکیر بنتی مٹتی رہتی ہے اور اس لحاظ سے گویا صحت کا تھرمامیٹر ہے جسکے ذریعہ سے۔ بیماریوں کے پیدا ہونے اور دور ہونے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں یہ لکیر گہری اور خوفناک ہوتی ہے۔ اور پھر مٹ جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بعد کو صحت اچھی ہوگئی۔ اسکی بہترین جائے وقوع نشان (۲-۲) سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن جس کے ہاتھ میں یہ لکیر نہ ہو وہ صحت کے لحاظ سے اور زیادہ خوش نصیب سمجھا جائیگا۔ اگر یہ خود عمر کی لکیر کی طرف نہ گئی ہو بلکہ اس سے کچھ خطوط نکل کر اس سے ملے ہوں تو معلوم ہوگا کہ ایسا آدمی ضرور کوئی بیماری رکھتا ہے جو اس کی صحت کو خراب کئے دیتی ہے۔

اگر یہ لکیر بہت سرخ ہو تو عصابی بخار کی علامت سمجھنی چاہئے۔ اگر بے قاعدہ ٹیڑھی میڑھی ہو اور رنگ زرد ہو تو جگر کی خرابی ظاہر ہوگی مگر بہت نمایاں ہو اور قلب و دماغ کی لکیر سے ملی ہو تو دماغی بخار کا اندیشہ پیدا ہوگا۔ لیکن اس لکیر کے ساتھ ناخنوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ جن سے انسانی صحت کا حال زیادہ معلوم ہوتا ہے (ان کا ذکر مئی ۱۹۲۷ء کے نگار میں آچکا ہے)

باقی ۔۔۔۔۔ باقی

عروس ادب :- یعنی حضرت ہوش بلگرامی سابق اڈیٹر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد کے ادبی تاریخی، اخلاقی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ جسکے متعلق تمام ملک کے اکابر و اہل قلم نے بہترین رائیں دی ہیں قیمت علاوہ محصول عکر ۔ **اصلاح سخن** :- جناب شوق سندیلوی کی غزلوں پر مختلف اساتذہ کی اصلاحوں کا مجموعہ خود انکی مختلف و متضاد رائیں اور ان کے متعدد پر لطف خطوط دیکھنے کی چیزیں ہیں قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :- منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

ہر قسم کے عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

ملاح کی لڑکی

(فسانہ)

بہت دنوں تک رام موہن ملاح کے کوئی اولاد نہ ہوئی کتنے ہی دیوی دیوتاؤں کی منت مانی۔ پیروں کی خوشامدیں کیں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر میں رام موہن کی بیوی نے گنگا مائی کی منت مانی کہ "گنگا مائی اگر میرے کوئی اولاد ہوئی تو میں ایک من بتاسے چڑھاؤں گی"۔ شاید گنگا مائی ایک من بتاسے کی لالچ میں آگئیں کچھ دنوں کے بعد ملاح کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ چھٹی کے دن ایک من بتاسے گنگا مائی کو دکھا کر "پرساد" کے نام سے سب گاؤں والے ہی بانٹ کر کھا گئے۔ پروہت جی نے بچار کر کہا "بتاسے چڑھانے سے لڑکی پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا نام "بتسیا" رکھنا چاہئے۔ پروہت جی کی بات مان لی گئی اور لڑکی نام بتسیا ہی رکھا گیا۔ بتسیا پیچ دار اور درخت سے لپٹی ہوئی بیل کی طرح بڑھی۔ گاؤں میں رہنے والی لڑکیوں کی طرح اس کے عضو عضو میں شگفتگی اور ملاحت آگئی حتیٰ کہ وہ اس سن کو پہنچ گئی جس کے آگے لڑکی کو کواری کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بتسیا بڑی ہنس مکھ اور خوبصورت تھی۔ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اُسے نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس کی سگائی بہت جلد سری بلدار کے لڑکے سروپ کے ساتھ ہو گئی۔ ہری بلدار گاؤں کے پاس بہنے والی "اچھامتی" ندی کے گھاٹ کا ٹھیکیدار تھا جس سے اسکو خوب آمدنی ہوتی تھی ایک طرح سے گھاٹ کا ٹھیکہ اس کا موروثی ہو گیا تھا کیونکہ ہر سال جب گھاٹ نیلام ہوتا تو سری ہلدار کے مقابلہ میں اور کوئی آدمی بولی نہ بولتا جس سے اسی کے نام پر نیلام ختم ہو جاتا۔ جب رام موہن نے اپنی لڑکی کا پیغام دیا تو اُس نے بخوشی منظور کر لیا اور طے ہوا کہ پھاگن میں بیاہ ہوگا۔ سروپ بھی اس نسبت سے بہت خوش تھا وہ بتسیا کے ساتھ لڑکپن میں کھیلا کرتا تھا اسی وقت سے اس کے دل میں بتسیا کی محبت تھی۔

پھاگن کے دو مہینے باقی تھے ایک دن گاؤں میں ایک جوتشی مہاراج آئے انھوں نے سروپ کا ہاتھ دیکھکر کہا "تیرے لیئے یہ سال خراب ہے" سروپ کی ماں نے سنا تو کہا "یہ سال نکل جائے تو سروپ کا بیاہ ہوگا"۔ عورت کی بات مردوں نے مان لی اسروپ کا بیاہ اس سال نہ ہو سکا۔

جوتشی جی سروپ کے لئے بتا گئے تھے کہ اس سال سروپ پر کوئی مصیبت آئے گی لیکن سروپ کو ایک دن بخار بھی نہ آیا مگر اس کی ماں ہیضہ کی بیماری میں چل بسیں۔ دوسرے سال بھی بیاہ کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اور وہ سال بھی یونہی گزر گیا۔ اب بتسیا کی عمر سولہ اور سروپ کی عمر بیس سال کی تھی۔ سری ہلدار نے بیاہ کے لئے جلدی مچانی شروع کر دی کیونکہ اس کے گھر میں گرہستی سنبھالنے والی کوئی عورت نہ تھی دونوں طرف سے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ نیک کام انجام نہ پا سکا۔ یکایک گاؤں میں سیتلا مائی نے زور پکڑا اور اس کے ساتھ ہی ہیضہ بھی نمودار ہو گیا۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا پہلے دیوتی پھر ہیضہ نے ملاحوں کے محلہ میں ڈیرا جما دیا آج اس گھر کا لڑکا

عطر منگانے کا پتہ ابھی نوٹ کر لیجئے۔ تار کا پتہ حنا لکھنؤ ہے

مرا تو کل اس گھر کی بہو مری۔ پرسوں "چودھرائن" مریں تو ترسوں "چودھری" چل بسے۔ اسی طرح ایک دن ہری ہلدار بھی بیمار ہوا اور دو ہی دن کے اندر سرگباش ہوگیا۔ رام موہن نے اپنے سمدھی کی بیماری میں بڑی خدمت کی اس نے اسکی تیمارداری میں اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی بیمار ہوگیا۔ اس کے ساتھ میں اس کی بیوی بھی بیمار پڑی اور ایک ہی دن کے اندر دونوں پرلوک سدھارے۔ رام موہن کی بڑھیا ماں اور اس کے بڑھاپے کا سہارا بتسیا زندہ بچ گئی۔ ہیضہ یا دیوی نے ان دونوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ آخر کار آدھے سے زیادہ گاؤں کا صفایا کرکے بیماری دوسرے گاؤں میں چلی گئی۔ بھلا اس آپادھاپی میں رام سروپ کا بیاہ کیسے ہوتا۔

(۲)

دو تین مہینے اور گزر گئے۔ رام موہن نے لڑکی کے بیاہ کے لئے تین سو روپے جمع کئے تھے اس سے بتسیا اور اس کی دادی اپنا گزر کرنے لگیں اسی حالت میں ایک دن پروہت جی رام موہن کے گھر آئے اور بڑھیا سے کہنے لگے "رام موہن تو اب اس دنیا میں نہیں ہے اب تم لوگوں کی بھلائی برائی کا خیال رکھنا میرا کام ہے۔ لڑکی بہت سیانی ہوگئی ہے اس کا بیاہ بہت جلد کر دینا چاہئے"

"بڑھیا نے جواب دیا" مہاراج! آپکے سوا ہمارے اور کون بیٹھا ہے جو کچھ مناسب سمجھئے کر دیجئے"

پروہت جی نے کہا "اچھا تم خاطر جمع رکھو میں آج ہی سروپ سے مل کر بیاہ کی تاریخ مقرر کراؤں گا" یہ کہکر پروہت جی چلے گئے۔ بتسیا گھر ہی میں تھی اس نے سب باتیں سن لیں۔ پروہت جی کے چلے جانے کے بعد بتسیا نے اپنی دادی سے کہا "اماں میں نے سب کچھ سن لیا ہے لیکن میں صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ میں ابھی بیاہ نہ کرونگی۔ ماں باپ کی جدائی کا رنج ابھی میرے دل سے دور نہیں ہوا" بڑھیا پوتی کی باتیں سنکر سناٹے میں آگئی کچھ دیر چپ رہ کر بڑھیا نے کہا "بتسیا! تو کہتی کیا ہے۔ بیاہ نہیں کرے گی۔ بتسیا! بیاہ نہیں کرے گی؟ ایسی بات منہ سے نہ نکال لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے"

بتسیا نے کچھ بگڑ کر جواب دیا "نہ میرے بھائی ہیں نہ بہن۔ پھر میں لوگوں کے کہنے سننے سے کیوں ڈروں۔ صرف تو ہی ہے تیری آنکھیں بند ہوتے ہی سب جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ میں کسی طرح بیاہ نہ کرونگی"

بڑھیا نے کھسیا کر کہا "بدقسمت لڑکی! بیاہ نہیں کرے گی تو کھائیگی کیا؟ تیرا باپ کوئی زمینداری تو چھوڑ نہیں گیا۔ اگر چھوڑ بھی جاتا تو بیٹھکر کھانے سے وہ بھی چند دنوں میں ہاتھ سے جاتی رہتی۔ آخر تیرا مطلب کیا ہے کیا تو سب میں کلنک کا ٹیکا لگوائے گی؟

بتسیا نے جواب دیا "کسی کی مجال نہیں جو رام موہن کی لڑکی کی طرف بری نظر سے دیکھے۔ کلنک کا ٹیکا لگانا ہنسی کھیل نہیں ہے تو پوچھتی ہے کھاؤنگی کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملاح کی لڑکی کے لئے کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ تو بوڑھی ہوگئی ہے گھر میں بیٹھی رہنا۔ میں گاؤں گاؤں گھوم پھر کر مچھلیاں بیچا کرونگی خود بھی کھاؤنگی اور تجھے بھی آرام سے کھلاؤنگی"

اب بڑھیا نے ذرا نرم ہو کر کہا "بیٹی یہ سب کچھ صحیح ہے مگر تو جوان ہے۔ سُندر ہے کیا تجھے کنواری رہنا چاہئے کہیں کسی کی جوان بیٹی عمر بھر کنواری رہتی ہے"

ہر قسم تازہ ترین روغن صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

بتیا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "دادی تیرا جو جی چاہے کہہ لے لیکن میں تو اس جنم میں اپنا بیاہ نہ کرونگی"

بڑھیا بولی "کیا سروپ پسند نہیں ہے اگر تو اس کے ساتھ بیاہ نہیں کرنا چاہتی تو میں دوسرا لڑکا تلاش کر دوں"

بتیا نے جواب دیا "میں کسی کے ساتھ بیاہ نہیں کرونگی اگر آئندہ تو نے پھر کبھی مجھ سے بیاہ کا چرچا کیا تو میں کہیں بھاگ جاؤنگی"

بڑھیا نے اداس ہو کر کہا "میرا کہنا تو نہیں مانے گی۔ اب میں جاکر سروپ سے کہتی ہوں شاید وہ تجھے راہ پر لے آئے" یہ کہکر بڑھیا سروپ کے پاس گئی اور اس سے سب حال کہا۔ سروپ نے کچھ دیر سوچ کر کہا "دادی تم اب گھر جاؤ میں بتیا سے مل کر اسکو سمجھاؤنگا"

(۳)

سروپ نے انتہائی کوشش کی بتیا کو بہت سمجھایا لیکن وہ برابر یہی کہتی گئی "میں بیاہ نہیں کرونگی۔ تم سے بھی نہیں —— اور کسی سے بھی نہیں"

کچھ عرصے کے بعد سروپ نے بتیا سے پھر کہا "بتیا دیکھو تمھاری ہی وجہ سے ابتک میں کوارا بیٹھا ہوں۔ میرے اور کوئی نہیں ہے کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمھیں پیار نہیں کرتا، کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ میں تمھاری قدر نہ کرونگا۔ ہائے تم کو کیا معلوم کہ میرے دل کی تمھاری محبت میں کیا حالت ہے۔ میں رات دن تمھیں کو یاد کیا کرتا ہوں۔ تم میرے دل میں بسی ہوئی ہو میں سر سے پیر تک تمھارا ہوں۔ رات کو جب سارا سنسار سو جاتا ہے تو میں تمھاری یاد میں جاگتا رہتا ہوں جب آندھی پانی آتا ہے اور مجھے ندی کے اس پار کھیوا لے کر جانا پڑتا ہے اسوقت بھی تمھاری یاد میرے دل کو ڈھارس دیتی ہے۔ جب رات کی "اندھیاری" میں ریتی پر کھچڑی پکاتا ہوں تب بھی دل میں تمھارا ہی خیال رہتا ہے تمھاری ہی موہنی صورت میرے آنکھوں کے سامنے ناچا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو تمھاری یاد میں ایسا بیخود ہو جاتا ہوں کہ نہ کھانے کی سدھ رہتی ہے نہ پینے کی نہ سونے کی" سروپ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اس کا دل بھر آیا اور آنسو آ گئے۔ معلوم نہیں کہ سروپ کی باتوں نے بتیا کے دل پر کیا اثر کیا اس نے بھی آج سروپ سے خوب دل کھول کر باتیں کیں اس نے پیشتر کبھی سروپ کی باتوں پر کچھ دھیان نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اس نے سروپ سے کہا "تمھارے کوئی نہیں ہے مگر میری بڑھیا دادی زندہ ہے۔ تمھارے ساتھ میرا بیاہ ہو گیا تو بڑھیا کہاں جائیگی۔ تم شاید اس کا جواب یہ دوگے کہ "میرے گھر میں آکر رہے گی"۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ رام موہن ملاح کی ماں مٹھی بھر اناج کے لئے داماد کا احسان نہیں اٹھا سکتی اور نہ میں اس بات کو پسند کرتی ہوں۔ میں خود کما کر اپنی دادی کو کھلاؤنگی اور تمھارا محتاج نہ ہونے دونگی۔ شاید تم اس بات کے لئے تیار ہو جاؤ کہ تم ہی خود میرے گھر میں رہوگے تو میں یہ پسند نہیں کرتی۔ میں تم کو پیار کرتی ہوں یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم اپنا گھر بار چھوڑ کر سسر کا گھر بساؤ یہ ظلم میں نہیں دیکھ سکتی جو آدمی اپنے بزرگوں کی کٹھیا اجاڑ کر بیاہ کے لالچ سے سسر کے گھر میں پڑ رہنے کو تیار ہو میں اسکے ساتھ بیاہ نہیں کر سکتی۔ بس مجھے جو کچھ کہنا تھا تم سے کہہ چکی آئندہ اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر تم پھر مجھ سے بیاہ کی بات چیت کروگے تو میں تم سے بولوں گی بھی نہیں"

سروپ چپ چاپ بتیا کی باتیں سنتا رہا۔ بتیا کے خاموش ہوتے ہی اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بتیا وہاں سے چلدی اور سروپ سر جھکائے کچھ دل میں سوچتا ہوا اپنی ناؤ پر بیٹھ گیا۔

صرف علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خرید کرنا چاہیے۔

بتسیا نے مچھلی بیچنا شروع کر دیا۔ ندی کے کنارے گھوم پھر کر وہ مچھیروں سے مچھلیاں خرید لیتی اور پھر ان کو اُس پار جا کر بازار میں بیچ آتی کچھ دنوں تک تو وہ سروپ ہی کی ناؤ پر بیٹھکر اسی کے گھاٹ سے آیا جایا کرتی تھی سروپ کو جب موقع ملتا وہ بتسیا کو اپنا دردِ دل سنایا کرتا تھا لیکن بتسیا کوئی جواب نہ دیتی۔ مہینہ گزرنے پر بتسیا نے چار آنے پیسے سروپ کے ہاتھ میں رکھدیئے اور کہا "یہ پار پہنچانے کی مزدوری ہے"۔ سروپ نے وہ پیسے ندی میں پھینک دئے اور کہا "بتاسو ! کیا میں تم سے مزدوری لے سکتا ہوں۔ تم نے کیا سمجھکر مجھے مزدوری دی ہے"؟ بتسیا نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ گھر چلی گئی۔ لیکن دوسرے دن سے اس نے سروپ کے گھاٹ سے پار اترنا چھوڑ دیا۔ گاؤں سے ایک کوس کے فاصلہ پر ایک اور گھاٹ تھا۔ بتسیا اسی گھاٹ سے آنے جانے لگی گو اس راہ سے اس کو روزانہ دو کوس زیادہ چلنا پڑتا تھا لیکن اس نے اسکی پرواہ نہ کی

ادھر سروپ کے گھاٹ سے اس کی ناؤ میں روزانہ ہر طرح کے آدمی پار اترتے تھے لیکن بتسیا نہ دکھائی دیتی تھی۔ پو پھٹنے کے وقت جب لوگ سورج دیوتا کی راہ دیکھتے سروپ اپنی ناؤ پر بیٹھا ہوا بتسیا کا انتظار کرتا دور سے لوگوں کو آتے ہوئے دیکھکر سروپ خیال کرتا کہ انمیں بتسیا ضرور ہوگی۔ لیکن جب وہ لوگ گھاٹ پر پہنچ جاتے اور بتسیا نہ دکھائی دیتی تو سروپ ایک لمبی سانس لیکر ناؤ کو کھول دیتا۔ کبھی کبھی وہ دن بھر ناؤ لئے بیٹھا رہتا لیکن بتسیا نہ آتی۔ اسی طرح بتسیا کے انتظار میں سروپ کے دن گزرنے لگے۔ شام کو جب پار سے آنے والا کوئی نہ ہوتا تو سروپ ناؤ پر بیٹھا ہوا بتسیا کی یاد میں محو ہو جاتا ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا اور وہ کنارے کی طرف دیکھنے لگتا کبھی کبھی تو اس کو عالمِ خیال میں ایسا معلوم ہوتا کہ بتسیا آ رہی ہے۔ جب رات زیادہ ہو جاتی اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں چلا جاتا دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں تارے کھلتے تو سروپ کو کسی کھیت کے رکھوالے کی بانسری کی آواز میں یہی معلوم ہوتا گویا بتسیا کی پیاری آواز اس کے کانوں میں آ رہی ہے وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگتا لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے بتسیا کی موہنی صورت نہ دکھائی دیتی۔

(۴)

اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ ایک دن سہ پہر کو بڑی زور سے آندھی آئی تین بجے سے ہی بادل گھر آئے تھے چار بجتے بجتے ہوا نے زور پکڑا آندھی کے ساتھ ہی مینہ کا بھی ایک بھاری جھلا آیا اور جھما جھم پانی برسنے لگا۔ اچھامتی کے لہروں کی آواز بہت خوفناک معلوم ہوتی تھی اور بڑے زوروں سے بھڑ بھڑ کرتی ہوئی کسی نامعلوم مقام کو بہتی چلی جا رہی تھی چاروں طرف اندھیر اچھایا ہوا تھا۔ نزاع ہستی کا خوفناک منظر دیکھکر سروپ نے ناؤ کو مضبوط رسی سے کنارے پر باندھ دیا اور جلدی سے اپنی جھونپڑی میں گھس گیا۔ پانی میں اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ اس نے انکو اتار کر دوسرے کپڑے پہن لئے ایک چلم بھر کر وہ تمباکو پینے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ باہر سے کوئی اس کا نام لیکر بلا رہا ہے۔

سروپ نے سوچا "ایں ! یہ تو پہچانی ہوئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس پیاری آواز سننے کے لئے تو میں ایک مہینہ سے بیتاب ہوں لیکن آج یہ کیا بات ہے ایسے ناوقت ایسی خوفناک آندھی پانی میں بھلا بتسیا یہاں کیوں آنے لگی ــــ نہیں نہیں یہ سب میرا وہم ہے ــــ بتسیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

ایسی مصیبت میں میرے جھونپڑے کے دروازہ پر کیوں آئے گی؟" یہ خیال کر کے سروپ چپ چاپ بیٹھا رہا لیکن کان آہٹ پر لگے رہے

تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی " سروپ! سروپ! کیا گھر میں ہو؟"

سروپ نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سامنے بتسیا سر پر ایک ٹوکری دھرے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ سروپ نے بتسیا کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا فوراً اس کے سر پر سے مچھلیوں کی ٹوکری اتاری اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھونپڑی کے اندر لے گیا، اور ایک طرف کھڑے ہو کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

بتسیا نے کہا " سروپ کیا تم مجھے اس وقت اس پار پہنچا دو گے"

" پار ——— ایسے ناوقت! ایسی آندھی پانی میں؟ بتاسو! تو کیا کہہ رہی ہے۔ اس خوفناک طوفان میں پار جانا ہو گا کس کو؟ بتاسو کو" بتسیا کہتی کیا ہے سروپ نے شاید اس کا مطلب نہیں سمجھا یہ سوچکر بتسیا نے پھر کہا " سروپ! مجھے پانچ بجے سے پیشتر ہی یہ مچھلیاں اس پار مکرجی کے ہاں پہنچانی ہیں۔ میں تین روپیہ بیعانہ بھی لے چکی ہوں مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس پار پہنچا دو۔ میں اس گھاٹ پر جہاں سے اب پار اترا کرتی ہوں گئی تھی لیکن وہاں کے ملاح اس طوفان میں اس پار ناؤ لیجانے کے لئے راضی نہیں ہوتے اسی سے مجبوراً اس مصیبت میں تمھارے پاس آئی ہوں۔ کیا تم ایسی حالت میں میری مدد نہیں کر سکتے ——— سروپ! تم مجھے پار پہنچا دو تمھارے سوا کوئی اور اس طوفان میں پار ناؤ لیجانے کی ہمت نہیں کر سکتا" اتنا کہکر بتسیا سروپ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی سروپ نے بتسیا کا ایسا روپ اور کبھی نہیں دیکھا تھا ایسی پیاری اور میٹھی بولی کبھی نہیں سنی تھی۔ اس وقت بتسیا کی عجیب حالت تھی اس کے سرخ رخساروں پر بھیگے بالوں کے گچھے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھونرے پھول پر بیٹھے ہوئے رس چوس رہے ہیں۔ بھیگی ساری کے اندر سے اس کا جسم چمپا کلی کے مانند خوبصورت نرم و نازک معلوم ہوتا تھا۔ سروپ نے اپنا کلیجہ تھام کر کہا " بتاسو! میں تم کو پار ضرور لے جا سکتا ہوں اسمیں کوئی شک نہیں ہے لیکن تم اگر نہ جاؤ تو کیا کام نہیں ہو سکتا۔ تم یہیں ٹھہرو میں ابھی اس پار جاکر مکرجی کے یہاں مچھلیاں دے کر واپس آجاؤں گا۔ بتاسو! تم نہ جاؤ آج بڑا خوفناک طوفان آیا ہے"

بتسیا نے جواب دیا " ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سروپ تم مجھے یہاں آرام سے بٹھا کر اکیلے پار جاؤ یہ نہیں ہو سکتا میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ چلو اب زیادہ دیر نہ کرو آندھی آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی ہے"

سروپ نے کہا " بتاسو! تم میرے لئے ڈرتی ہو ایسی بات تو تم نے اپنے منہ سے کبھی نہیں نکالی۔ اچھا چلو آج میں تم کو اس پار لے چلوں گا۔ سروپ آج آندھی پانی سے لڑ کر ناؤ کو اس پار لیجائے گا۔ اٹھو ——— بتاسو! اٹھو۔ تم کو پار لیجانے کا یہی وقت ٹھیک ہے" اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ سروپ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اس کا ریشہ ریشہ نشۂ محبت میں سرشار ہو گیا بتسیا کی شیریں بیانی نے سروپ کے دل میں ایک آگ لگا دی اس نے بتسیا کی ٹوکری سر پر رکھ لی اور بتسیا نے ناؤ کے دونوں ڈانڈ اٹھا لئے۔

روغن کیوڑہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال فرمائیے

ندی کے اندر ناؤ کا کھولنا دشوار تھا۔ پرجوش لہروں سے ناؤ ڈگمگا رہی تھی بڑی مشکل سے سروپ نے بتیا کو ناؤ پر سوار کیا پھر اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھکر بتیا کے پیارے مکھڑے کو دیکھا اور "اچھا متی مائی کی جے" کہکر ناؤ کو کھول دیا۔ ناؤ ناچتی ہوئی منجھدار کی طرف چلی سروپ نے اسوقت بتیا سے کہا "بتاسو! تم اس وقت میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ دیکھو آج میں تمکو پار لے جاسکتا ہوں کہ نہیں" اتنا کہکر سروپ زور سے گانے لگا۔

پربھو موری نیا ڈگمگ ڈولے

آر پار سوجھت ناہی ناؤ پڑی منجھدار   مولا اپنی موج سے کردو بیڑا پار

بالم موری نیا ڈگمگ ڈولے

(۵)

سروپ آندھی پانی سے لڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بتیا رہ رہ کر کہتی جاتی تھی "بائیں سروپ! بائیں لہر کاٹو۔ وہ لہر آرہی ہے اس سے ناؤ کو بچاؤ" یہ کہکر وہ بڑی محبت سے سروپ کی طرف دیکھنے لگتی۔ سروپ بھی اپنے دل کو بڑھانے کے لئے خود بخود کہتا جاتا تھا "شاباش! اور تھوڑی دور ہے۔ شاباش" جب وہ بہت تھک جاتا تو بتیا کی طرف دیکھنے لگتا جس سے اس کے دل میں اس کے بازوؤں میں پھر نئی طاقت آجاتی۔

آخر کار سروپ کی ناؤ اس پار پہنچ گئی سروپ نے جلدی سے کنارے اتر کر ناؤ کو ایک برگد کی جڑ میں باندھ دیا۔ ابھی شام ہونے میں کافی وقت تھا سروپ بہت تھک گیا تھا وہ وہیں ندی کے کنارے ریت پر بیٹھ گیا اسوقت بھی پانی برس رہا تھا بتیا نے سروپ سے کہا "سروپ! آج اس پار جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناؤ یہیں بندھی رہنے دو اور تم میرے ساتھ بازار چلو وہیں کسی دوکان میں آج آرام کر لینا میں جو روپے مکرجی کے یہاں سے پاؤنگی تم کو دیدے دونگی اس میں تم اپنے کھانے پینے کا انتظام کر لینا میں بابوجی کے یہاں کسی کونے میں پڑ رہونگی جب صبح ہوگی تو اس پار چلیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا"

سروپ اٹھکر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "بتاسو! ایسا نہیں ہوسکتا تم کو پھر اس پار پہنچائے بغیر مجھے چین نہ ملیگا میں تم کو اس پار سے لے آیا ہوں اس پار آج ہی پہنچاؤں گا۔ جب تک تم مکرجی کے یہاں سے لوٹ کر نہ آؤگی میں اسی ناؤ پر بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کرونگا چاہے کتنی ہی مصیبت میرے سر پر کیوں نہ آئے میں یہاں سے نہ ٹلوں گا"

بتیا نے ہنسکر کہا "اور اگر میں واپس نہ آؤں تو"

سروپ نے جواب دیا "تو پھر سروپ کی زندگی میں یہی آخری بار ناؤ کھینا ہے۔ اب سروپ اور کسی کو پار نہیں لے جائے گا جسکو پار پہنچانے کے لئے وہ آج تک زندہ رہا وہی اگر پار نہ جائے گی تو سروپ بھی اب کھیوا نہ لے جائے گا"

بتیا سر جھکا کر کچھ سوچتی رہی اس کے بعد بولی "اچھا تم یہیں ٹھہرو میں مچھلیاں دے کر واپس آتی ہوں۔ پھر ہم دونوں گھر واپس چلیں گے" اتنا کہکر بتیا نے مچھلیوں کی ٹوکری سر پر رکھ لی اور مکرجی کے مکان کی طرف جلدی سے چلی۔ سروپ ٹکٹکی باندھ کر بتیا کی طرف دیکھتا رہا اور جب وہ

اصلی روغن بادام کہاں ملتا ہے اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو ایک لمبی سانس بھر کر لمبا لمبا ناؤ پر لیٹ گیا۔ اس وقت پانی تھم گیا تھا۔ کبھی کبھی بوندا باندی ہونے لگتی تھی شام ہونے میں کچھ دیر تھی کہ بتسیا واپس آگئی اسوقت آسمان میں ایک کالی گھٹا اٹھتی ہوئی دکھائی دی اسوقت چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن ندی سے بہت دور کئی پرشور نالوں سے گزر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے اور ان کی مینڈوں پر کسان جابجا کھیتوں کی نگہ بانی کر رہے تھے۔ بتسیانے پکارا "سروپ"

سروپ بتسیا کہتا ہوا ناؤ سے اٹھ کر چھلانگ مار کر بتسیا کے پاس پہنچ گیا۔ بتسیانے آسمان پر نئی اٹھنے والی کالی گھٹا کو دکھا کر کہا "سروپ یہ گھٹا خوفناک معلوم ہوتی ہے ذرا سمجھ بوجھکر ناؤ کھولنا"

سروپ نے آسمان کی طرف دیکھکر کہا "یہ گھٹا معمولی ہے یہ اچھی طرح آسمان میں پھیلنے بھی نہ پائے گی کہ ہم اس پار پہنچ جائیں گے۔ بتاسو آؤ ناؤ پر بیٹھ جاؤ"

بتاسو نے ناؤ پر بیٹھکر کہا "سروپ! گھٹا کا رنگ ڈھنگ دیکھ لو تب چلو" سروپ نے بتسیا کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا اور ناؤ کھول دی۔ منجھدار میں پہنچنے سے پہلے ہی بڑے زور کا طوفان آگیا اور وہ کالی گھٹا چاروں طرف چھاگئی۔ سروپ نے بتسیا سے کہا "بتاسو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ سامنے کنارہ دکھائی دیتا ہے بس اب پہنچ گئے"

بتسیا کچھ دور پر ناؤ کے دوسرے سرے پر بیٹھی تھی وہ کھسک کر سروپ کے پاس آگئی۔ سروپ بڑی پھرتی سے ڈانڈ چلانے لگا۔ اسوقت یکایک "ہال" ٹوٹ گیا۔ سروپ پانی میں گرتے گرتے بچا۔ ناؤ لہروں سے ٹکرانے لگی تب سروپ نے چلاکر کہا "بتاسو" اب کوئی اُمید نہیں ہے "ڈانڈ کہاں ہیں" بتسیا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ بھی نہیں تھے ان کو نہ معلوم ہو سکا کہ ہال ٹوٹنے پر گھبراہٹ میں دونوں ڈانڈ پانی میں گر پڑے تھے۔ سروپ نے کہا "بتاسو! اب بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے دیکھو وہ جو بڑی لہر اس طرف آرہی ہے اسی میں ہماری ناؤ پلٹ کر ڈوب جائیگی" بادلوں کا کالا بھنور جھوم جھوم کر برسنے لگا۔ بتسیا اٹھکر کھڑی ہوگئی اور اسنے کہا "سروپ! تم کیوں گھبرا رہے ہو؟ کیا تم مرنے سے ڈرتے ہو؟ آؤ میری پریم کی نیا کو پار لگانے والے سروپ آؤ ہم دونوں لپٹ کر اجھامتی مائی کی گود میں بخوشی جان دیدیں۔ آج ہمارا بیاہ ہے سروپ آج ہمارا بیاہ ہے۔ اتنا کہکر بتسیا سروپ سے لپٹ گئی۔ سروپ نے خوب بھیچ کر اسکو اپنی چھاتی سے لگالیا اور کہا "بتاسو! اسی بیاہ کے لئے میں تو اجتک زندہ تھا" بتسیانے پھر چلاکر کہا "سروپ چلو ہم اس پار چلیں آج ہمارا بیاہ ہے" دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ضبط و استقلال کے لنگر اُکھڑ گئے اور جذبات دروکی کشتی پریم کے اتھاہ ساگر میں ہچکولے کھانے لگی ٹھیک اسی وقت بے پرواہ اور سرشار جوانی کی طرح چڑھی ہوئی ندی کی ایک بہت بڑی لہر اچھلتی کودتی آئی اور اس نے ناؤ کو پلٹ دیا۔ سروپ اور بتسیا دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اجھامتی کی لہروں میں غائب ہوگئے۔ آسمان اور زمین! رنج اور خوشی! موت اور زندگی سب ملکر ایک ناقابل برداشت خوشی کی موجوں میں ڈوب گئے۔ بدل گنج (بنگال) میں سروپ اور بتسیا کی یہ پریم کتھا آج تک زبان زد خاص عام ہے جس گھاٹ کے سامنے ناؤ ڈوبی تھی اسے اب تک لوگ "سروپ مانجھی کا گھاٹ" کہتے ہیں۔

اعظم کریوی

(ماخوذ)

اصلی روغن کاہو کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر کا بنایا ہو بہت مفید ہے

رامائن کے چھ ورق

پہلا ورق :-

رام اور لچھمن جنگل میں یا شیر کچھار کے اندر ہیں — مارچہ کو بھگا کر بیٹھے ہیں، اور کیسے شاد و مظفر ہیں
گھر واپس ہونے کے لئے آمادہ ہیں اور مضطر ہیں

(۲)

ادہر کیطرف سے راستے میں اک گرد اٹھی دہندلی دہندلی — جب نزدیک آکے گرد بھٹی تو اسمیں سے اک ٹولی نکلی
چرنوں کو چھو کر شہزادوں کے وہ چپکے چپکے کہنے لگی

(۳)

راجہ جنک جی نے متھلا کے جشن عظیم کیا ہے برپا — شیوجی کی کمان اس محفل میں جو بھی آکے چڑھا دیگا
دیدینگے اُس کو مہاراجہ اپنی پیاری بیٹی سیتا

(۴)

یہ سن کے چلے متھلا کیطرف وہ دونوں بہادر تیزی سے — پہونچے جو وہاں تو کیا دیکھا ہیں جمع ہزاروں شہزادے
سب کے دل میں ہے یہی ارمان شیوجی کی کمان چڑھا دیجئے

(۵)

کی سب نے باری باری کوشش لیکن سب ناکام رہے — وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی مایوس ہوئے بدنام رہے
اب ہمت والوں میں باقی اک لچھمن اور اک رام رہے

(۶)

جب نوبت رام کی آپہونچی، شیروں کی طرح پنجہ ڈالا — اور اسکو اُٹھایا سینہ تک جیسے ہو کوئی گلدستہ
ایسے بہادر کو حیرت سے ہر بچے بوڑھے نے دیکھا

(۷)

دیکھے کھینچی شیر نے اب پوری بل سے شیو کی کمان — وہ لچکی اور وہ جھکنے لگی لو ملگئے دونوں کونے دہاں

روح گلاب صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگانا چاہئے

کڑکی بیچ سے اور تڑکی دو ٹکڑے نیں وہ کمانِ گران

(۸)

ایسی کڑکی جیسے بادل ایسی ٹوٹی جیسے بجلی　　شور مچا یہ چار طرف لو جیت ہی لی اُس نے بازی
سیتا نے خود رام کی گردن میں پھولونکی مالا ڈالی

(۹)

ہونٹوں پہ جنک جی کے آخر رخصت کی ہوئی کلمے جاری　　اے دسرتھ کے بیٹے بے جواب تیری ہے سیتا پیاری
جیسے مجھے خوش اسکو رکھنا دولت تھی یہی میری ساری

(۱۰)

جیسے ہو سایہ اور بدن یہ ساتھ تمھارا یوں دیگی　　ممکن ہے کبھی بھولے سے اگر ہو جائے کوئی اس سے غلطی
بے سمجھے بوجھے تم ہرگز اس پر نہ دکھانا کچھ خفگی

(۱۱)

چہرے سے نقاب ہٹی جس دم ساون کی بجلی کوند گئی　　لوگوں کی نظریں جھک گئیں آنکھوں میں چکا چوندھ ایسی ہوئی
سو چاند سے بڑھ کر تاباں تھی وہ حسن و جوانی کی دیوی

دوسرا ورق:—

عجیب اک بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی ہر گلی گلی میں　　لٹا رہے ہیں تمام پھول اپنی اپنی دولت ہنسی ہنسی میں
مسرتوں کی رواں ہیں نہریں اجودھیا کی گلی گلی میں

(۲)

مگر محل میں ہر ایک ذرہ پہ صاف چھائی ہے سخت اداسی　　نہ جانے کیوں آج تڑکے تڑکے ہوئی ہے یوں رام جی کی طلبی
ضرور کل شب کو بوڑھے راجہ پہ چل گئی موہنی کسی کی

(۳)

چھری سی اک پھر گئی جگر پر جو باپ کے پاس رام پہونچے　　وہ فرطِ شدت سے ہچکیوں کی عجیب تصویرِ غم بنے تھے
نہ بولنے کی تھی تاب اُنہیں نہ سر اُٹھانے کی دردِ دل سے

(۴)

جو رام نے دیکھی ایسی حالت تو جھک کے بولے کہ میری ماتا　　اُداس کیوں ہیں پتا ہمارے بتایئے کچھ قصور میرا

تو کیکئی مثل شیرنی کے گرج کے بولی کہ سن لو بیٹا

(۵)

خفا نہیں تم سے راجہ دسرتھ مگر ضروری ہیں چند باتیں
ہوئے تھے زخمی یہ اک لڑائی میں جل گئی تھیں عدو کی گھاتیں
بچائی تھی میں نے جان انکی تڑپ کے کاٹی تھیں کالی راتیں

(۶)

انھوں نے دو بخششوں کا وعدہ کیا تھا صحت کے بعد مجھ سے
وہ وقت اب آگیا ہے شاید کہ پورے دیکھوں میں انکے وعدے
مدد کرو اپنے باپ کی تم اگر ہو نیک اور سعید بیٹے

(۷)

بھرت جو ہے میرا پیارا بیٹا وہ بیٹھے گا تخت سلطنت پر
تم آج سے چودہ سال پورے رہوگے اپنے وطن سے باہر
جو لاج رکھنی ہو بوڑھے بابا کی تم نہ ہونا ذرا مکدر

(۸)

بڑی مسرت سے رام جی نے سُنے یہ احکام سخت ماں کے
کہا کہ میرے لئے نہ ہوگی خوشی کوئی بڑھ کے اس خوشی سے
کہ باپ کا حکم میں بجا لاؤں اور وعدے ہوں انکے پورے

(۹)

بھرت کو بولائے میں جاتا ہوں آج ڈھنڈک کی سمت ماتا
مگر پریشان کیوں ہیں بابا نثار تن من ہو ان پہ میرا
انھیں یہ سمجھاؤ کہ خوش ہوں نہیں ہے سرکش غلام انکا

تیسرا ورق :-

رخصت کر دو ہم کو پیاری بستے ہیں ہم آج سے بن میں
چودہ سال گزر جائیں گے آنکھ جھپکتے دار محن میں

(۲)

سیتا بولیں میں بھی چلوں گی ساتھ تمھارے جوگن بن کر
سیج بچھاؤنگی کلیوں کی جنگل جنگل مالن بن کر ؏

(۳)

بولے وہ دکھ درد بہت ہیں جنگل کے رہنے میں پیاری
وہ لوں اور وہ دھوپ کی شدت اور تم ایسی راج دلاری

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

(۴)

یہ بولیں جب دیکھونگی میں چاند ایسے مکھڑے کو تمھارے
درد ہیں جتنے ہوں گے دو اب دکھ ہو جائیں گے کنارے

(۵)

بولے وہ کھانے کے لئے کڑوے کڑوے پھل پائینگے
یہ بولیں جب آپ رہینگے میٹھے ہو جائینگے

(۶)

بولے وہ کیا ہوگا پیاری ہوگی جبدم پیاس کی شدت
یہ بولیں آواز تمھاری رکھتی ہے امرت کی لذت

(۷)

وہ بولے کھالیں اور چھالیں ہونگی بس دو چیزیں کپڑے
یہ بولیں دشمنوں کی خاطر پاربتی نے جو پہنے تھے

(۸)

وہ بولے کہ چٹانوں پر اور سخت زمین پر ہوگا سونا
یہ بولیں پہلو میں تمھارے دوب بھی مخمل کا بچھونا

(۹)

وہ بولے آفت سے بھرا ہے ہر جنگل کا کونا کونا
یہ بولیں تم جا ہوگے تو مٹی ہوگی مجھ کو سونا

(۱۰)

ساتھ مصیبت میں گر چھوڑوں باپن ہو جاؤنگی پیارے
عصمت و الفت کی دنیا میں کیا منھ دکھلاؤنگی پیارے

چوتھا ورق :-

بنجاوتی کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہے
طاؤس رقص میں ہیں چھائی ہوئی گھٹا ہے
ساون کی بجلیوں میں اک حشر سا بپا ہے

(۲)

بادل ابھی تھمے ہیں گھنٹوں سے روتے روتے
چپکے سے لی ہے کروٹ سبزہ نے سوتے سوتے
کوئل نے دم لیا ہے جان اپنی کھوتے کھوتے

(۳)

بیٹھے ہیں اک کٹی میں بے فکر رام و سیتا
اتنے میں ایک آہو اُن کی نظر سے گزرا
بھرتا ہوا اچھلاوے اٹکھیلیاں دکھاتا

(۴)

کندن کی جگمگاہٹ تھی جلد سے ہویدا
چاندی کا کام سارے تن پر بنا ہوا تھا
تھا سینگ اس کا جیسے یاقوت سے تراشا

(۵)

یہ خوشنما چرندہ سیتا کو ایسا بھایا
کہنے لگیں کہ پیارے ہر دیشور مسیحا
جنگل سے اس کو لادو زندہ ملے کہ مردا

(۶)

شاید دغا ہو اسمیں پہلے تو رام سوچے
سیتا کی ضد سے لیکن مجبور ہو کے بولے
لچھمن یہیں پہ رہنا جب تک نہ بھائی آئے

(۷)

جنگل کو چل دیئے پھر تیر و کمان لے کر
قابو نہ اسپہ پایا کھائے بہت سے چکر
آخر چلایا ناوک سوئے غزال جمکر

(۸)

زخمی ہوا ہرن تو بے چین ہو کے تڑپا
اور رام کی زبان میں مکاریوں پکارا
لچھمن مدد کو آؤ میری خبر لو سیتا

(۹)

سیتا تڑپ گئی جب آواز درد آئی
کہنے لگی کہ لچھمن جاؤ مدد کو جلدی
وہ بولے کیسے جاؤں جب تک نہ آئیں بھائی

(۱۰)

غصہ میں آکے بولیں سیتا کہ تم ہو بزدل
حیلہ ہے اک وفا کا قابو میں خود نہیں دل
میرے مقابلہ میں ہے مکر چلتا مشکل

(۱۱)

لچھمن کو تاب ایسے الزام کی کہاں تھی
چپکے سے ہوگئے وہ جنگل کے سمت راہی

ہر قسم کے بہترین عرقیات اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خریدئے

حسن و وفا کی دیوی بس رہ گئی اکیلی ہو

(۱۲)

اتنے میں اک بھکاری آیا کٹی کے در پر ۔ پہلے تو اُس کو دیکھا سیتا نے ہو کے مضطر
دیکھا کہ برہمن ہے تب دور ہو گیا ڈر ہو

(۱۳)

دینے لگیں وہ لا کر پھل اور سرد پانی ۔ راون نے پھاڑ ڈالا بھیس اپنا زعفرانی
شیطان بن کے اپنی کہنے لگا کہانی ہو

(۱۴)

بن جاؤ میری بیوی تم پر فدا ہوں سیتا ۔ لنکا کی ہو گی رانی اور میرے دل کی آشا
خدمت کریں گے لاکھوں میں بھی کروں گا پوجا

(۱۵)

نفرت کے ساتھ بولیں سیتا کہ دور ہو جا ۔ میں اور تیری بیوی پاگل ہوا ہی تو کیا
آنے تو دے انھیں تو بگڑے گا تیرا نقشا ہا

(۱۶)

سنتے ہی یہ سخن وہ بس ہو گیا بگولا ہو ۔ ظالم نے بال پکڑے اور گود میں اُٹھایا
اپنی ہوائی گاڑی میں جبر سے بٹھایا

(۱۷)

طیارہ بن کے گاڑی اڑنے لگی ہوا پر ۔ فطرت کو آگیا خود لرزہ سا اس جفا پر
سورج گہن میں آیا تیرگی فضا پر

(۱۸)

سیتا نہ باز آئیں اکدم کو بھی فغاں سے ۔ آجاؤ رام پیارے صدقے گئی میں جان سے
لچھمن بچاؤ دکھ سے لاؤں تمھیں کہاں سے

(۱۹)

آخر کو وہ جفا جو لنکا میں آکے اترا ۔ اپنا محل دکھایا اور شہر کا تماشا

کہنے لگا وہ موذی کر لو غلام اپنا

(۲۰)

شیطان ہوش میں آ غصہ سے بولیں سیتا
دس لاکھ مرتبہ بھی مر کر جو ہوں میں زندہ
اک بار بھی نہ ہوگی پوری تری تمنا

(۲۱)

سنتے ہی یہ ستمگر طیش و غضب میں آیا
بولا کہ دو مہینے دیتا ہوں تم کو اچھا
ورنہ قسم ہے اپنی کھالوں گا کر کے قیما

پانچواں ورق :-

ساقی پلا دے آج کہ وقت خمار ہے
لنکا میں گرم معرکہ گیر و دار ہے

(۲)

آپس کے تفرقوں کو مٹا دے وہ مے پلا
بچھڑے ہوؤں کو آج ملا دے وہ مے پلا

(۳)

راون کھڑا ہے ایک طرف رام اِکطرف
کانٹے ہیں ایک سمت گل اندام اِکطرف

(۴)

ناوک برس رہے ہیں کہ ساونکی ہے جھڑی
تیر ویں ڈوب جاتے ہیں دونوں گھڑی گھڑی

(۵)

ترکش جو خالی ہوگئے تلواریں کھنچ گئیں
دو بجلیاں چمکنے لگیں اودھ کیوں چلیں

(۶)

سورج بھی ڈھل گیا رام اسطرح لڑے
راون کے ایک ساتھ دسوں سر قلم کئے

(۷)

لیکن ابھی پلک بھی نہ جھپکانے پائے تھے
دس سر نئے کٹی ہوئی گردن پہ آگئے

(۸)

تلوار کو نیام میں پھر تھک کے رکھ لیا
اور تیر اندر کا سوئے راون رہا کیا

صفدر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ سے ہمیشہ عطر منگائیے

(۹)

ناوک کی شکل میں یہ اجل کا پیام تھا　　برما کے دل کو چھید کے باہر نکل گیا

(۱۰)

یوں فتح پا کے رام کھڑے تھے بہ کرّ و فر　　جیسے ہو چاند حسن و لطافت کے اوج پر

چھٹا ورق :-

دشمنوں کو مار کر تمکو چھڑایا میں نے آج　　اپنی حرمت اور عزت کو بچایا میں نے آج

حق کی قوت اور صداقت کو دکھایا میں نے آج

(۲)

پاس رکھ سکتا نہیں تمکو بہت معذور ہوں　　مجھکو عزت چاہئے الفت سے کوسوں دور ہوں

تم ہمینوں غیر کے گھر میں رہیں مجبور ہوں

(۳)

دلشکن الفاظ ایسے سنکے سیتا رو پڑی　　بےبسی پر اپنی وہ مجبور دکھیا رو پڑی

اسطرح روئی کہ اسکے ساتھ دنیا رو پڑی

(۴)

اور کہا لچھمن سے جلدی کر دو طیار اک چتا　　کچھ خرابی ہے تو جل جاؤنگی اسمیں برملا

ورنہ خود شعلے مری عصمت پہ ہونگے فدا

(۵)

جب چتا روشن ہوئی حیرت سے سب بت ہو گئے　　اسمیں داخل ہو گئیں سیتا عجب انداز سے

لے لیا شعلوں نے بھر آغوش اپنی کھول کے

(۶)

بعد تھوڑی دیر کے شعلے بجھے اک در بنا　　اگنی دیوتا آئے اس در سے بصد حسن ضیا

اُن کے زانو پر تھیں سیتا صاف جیسے آئینہ

ہر قسم کے عطر و تیل اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

(۷)

اگنی دیوتا نے کہا میں جانتا ہوں دل کا حال — آگ سے بچ جائے میری کوئی پاپی کیا مجال
اب نہ کرنا عفت و عصمت میں اسکی قیل و قال

(۸)

رام بولے ہنس کے مجھکو تو کبھی کچھ شک نہ تھا — امتحان دنیا کی خاطر میں نے سیتا کا لیا
سب پہ روشن ہو گیا پیاری ہے میری پارسا

(۹)

ایک گدی پر ہو جب چاند سورج جلوہ گر — بن گیا تصویر حیرت پڑ گئی جس کی نظر
پھر نہ بھارت نے کبھی پیدا کئے ایسے گہر

طالب الہ آبادی

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

مہتمم دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس تبدیلی سے اتنا ہوا کہ گورنمنٹ کو مالگزاری جمع کرنے میں بہت کم اخراجات برداشت کرنے پڑے اور ساتھ ہی روپیہ اس کے ہاتھ آگیا۔ اس سے اس نے سمجھا کہ یہ طریقہ فائدہ مند ہے اور مالی استدلال کے لازمی عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ قرض لینے میں ترقی ہوگئی۔ پھر دلیل یہ پیش کی گئی کہ اگر سرمایہ کو زمین میں لگا دیا گیا تو مالگزاری کی بیشی کے ساتھ ساتھ زراعت پیشہ آبادی کی دولت میں بھی اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن سرمایہ کو لگانے کی اس سے بہتر اور کیا ترغیب ہو سکتی ہے کہ اسکی حفاظت وضمانت کو بڑھا دیا جائے کسان کو قرض حاصل کرنے میں مدد دینے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کھیت کی فصل کے علاوہ اور کوئی زیادہ قیمت کی شے اپنے قرض خواہ کو پیش کرے۔ کھیت ہی کو کیوں پیش نہیں کر دیا جاتا؟ اسی لئے بعد میں رہن اور قرض واپس لینے کے قوانین نافذ کئے گئے۔ عدالتیں مقرر کی گئیں۔ اس عمل نے کسان کی تباہی کی تکمیل کر دی۔ یہ دیکھکر کہ روپیہ ہر وقت اور حسب ضرورت مل سکتا ہے اس نے کسی پس وپیش کے بغیر قرض لینا شروع کر دیا۔ صرف مالگزاری ادا کرنے اور اپنی زمین کی تزئین وترقی کرنے کی غرض سے بلکہ اپنی آرام وآسائش کے لئے بھی۔ جو تفصیلات میں نے بیان کی ہیں خواہ وہ غلط ہوں یا صحیح، اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں برطانوی ہندوستان میں کوئی بھی گاؤں ایسا نہیں جو شدت کے ساتھ مقروض نہو۔ تحقیقات کے سلسلہ میں مجھے بنگال میں بھی کوئی ایسا گاؤں نہیں ملا جو کلیتہً قرض سے آزاد ہو*

یہ آخری انتہائی خرابی ہے جو انگریزی نظام حکومت نے ہندوستانی کسانوں پر عاید کی ہے اور جب ان کے افلاس اور روز افزوں مالی ذمہ داریوں کا خیال کیا جاتا ہے تو اسوقت سر جان اسٹریچی جیسے اشخاص کے خیالات کے ساتھ متفق ہونا مشکل ہو جاتا ہے جو ہندوستان میں اپنے کام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کریگا کہ ہم نے زراعتی ہندوستان کے لئے مفید کام نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ——

—— ہم نے اُسے نقصان تو نہیں پہنچا دیا؟ ہم نے کسان کو اتنا فائدہ پہنچایا ہے کہ زبردستی کوئی شخص اسے جان سے نہیں مار سکتا لیکن ہم نے غالباً فاقہ کشی کے ذریعہ اسکی موت کے خطرے کو بڑھا دیا ہے یہی شبہ سمجھدار ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے اور انگریزوں کیلئے اچھا ہوگا اگر وہ اسپر غور کریں اس سے بیشتر کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے*

ہندوستان کے روز افزوں افلاس کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے۔ بیں ایسے مریض کے لئے جسے کلیتہً تبدیلی علاج کی ضرورت ہے اور جو مالی آرام کی طویل مہلت چاہتا ہے، امپیریل گورنمنٹ کی قانون سازی کی جانب سے قدرے مشتبہ ہوں۔ اور میں بنگال رینٹ ایکٹ، یا زراعتی بنکوں کے قیام یا لوکل سیلف گورنمنٹ کی تجاویز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں

عطر ملنے کا پتہ۔ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

جو بجائے خود ان برائیوں کے خلاف کافی روک پیدا کرنے والی ثابت ہو سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن سے یہ فائدہ پہنچیگا کہ لوگوں پر جو بوجھ ہے اُسے کسی حد تک اِدھر سے اُدھر منتقل کر دیا جائیگا۔ وہ تجاویز ان کے بوجھ میں سے ایک پائی بھی کم نہیں کریں گی اور نہ گورنمنٹ کے شفیقانہ ارادوں پر پبلک کا اعتماد قائم کرنے میں مدد دیں گی اور اس مصیبت کو ایک سال کے لئے ملتوی کریں گی جو پالیسی کے موجودہ اصولوں کے مطابق لازمی طور پر نازل ہوگی۔ قوانین نہیں بلکہ مالیات تمام برائی کی جڑ ہے اور جب تک اُسے مفید بنیاد پر قائم نہ کیا جائیگا، باقی علاج مفید ثابت نہ ہوگا +

جب میں کلکتہ میں تھا تو اسوقت ہندوستانی ماہرین اقتصادیات سے طول طویل بحثیں رہا کرتی تھیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوسرے شہروں کے خیالات اس بارے میں کیا ہیں۔ اور صوبہ کی ضروریات کے متعلق مجھے تعلیم دینے کی غرض سے بمبئی میں جو خاص جلسہ کیا گیا تھا، اس کا موضوع یہی تھا۔ اس لئے میں کہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی مالیات کے متعلق جو کچھ ہندوستانیوں کے خیالات ہیں، میں ان سے واقف ہوں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ کلکتہ کے بجٹ میں یہ خرابی ہے کہ وزیر مالیات محض اس ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کے بجائے جسکی وہ خدمت کر رہا ہے جیساکہ ہر ملک میں کیا جاتا ہے، ہندوستان میں ہندوستان کے مفاد کے بجائے انگلستان کے فوائد کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی ضروریات کی جانب توجہ کرنے سے پہلے دو قسم کے انگریزی مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اول یہ کہ اینگلو انڈین نظام حکومت کو قائم رکھا جائے اور اسے پوری تنخواہ اور الاؤنس دیا جائے اور دوسرے یہ کہ انگریزی تجارت کو ہر قسم کا فائدہ پہنچایا جائے میرے لئے یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے سول اور فوجی محکموں کے کثیر اخراجات کے مسئلہ پر کچھ کہوں۔ تمام دنیا میں یہ حکومت اپنے کثیر اخراجات کے لئے بدنام ہو چکی ہے۔ اور اگرچہ وہ یہ دعوی کر سکتی ہے کہ ہم قابل ترین ہیں تاہم مالی اعتبار سے ناکام ہونے سے اسے کوئی قوت نہیں روک سکتی +

ہندوستان میں جو لوگ سیاحت کرنے کی غرض سے آتے ہیں، وہ یہ دیکھکر حیران رہ جاتے ہیں کہ ایک انگریز ملازم خواہ اس کی کتنی ہی معمولی حیثیت کیوں نہ ہو نہایت ٹھاٹھ کے ساتھ رہتا ہے۔ گورنروں اور لفٹنٹ گورنروں کے محلات پہاڑوں پر ان کی قیام گاہیں، ان کی ضیافتیں اور دعوتیں ان کے ملازمین کی وسیع تعداد، ان کے گھوڑے گاڑیاں سفر کرتے وقت ان کی اسپشل ٹرینیں، ان کے خیمے، ان کے عملے اور ملازمین وغیرہ یہ تمام باتیں اُن کی فضول خرچی کو ظاہر کرنے کے لئے کفایت کرتی ہیں جنگلوں میں بھی ہر بنگلہ میں ایسی شان کی ضیافت کیجاتی ہے اور بہترین غیر ملکی کھانے جنہیں دل لبھانے والی شراب کا بھی زبردست جزو شامل ہوتا ہے، انھیں ہر رات کو ان کے تنہا مقامات میں یہ تلخ حقیقت بھلا دینے میں مددگار ہوتے ہیں، کہ وہ ایشیا میں ہیں اور اپنے ملک سے دور ہیں۔ دوزخ کا خوف دلانے پر بھی کسی کلکٹر کی بیوی ہندوستان کی ساختہ چیزیں زیب تن نہیں کریگی اور اس کا سارا ساز و سامان حتیٰ کہ غالیچے وغیرہ بھی سب کے سب انگریزی کارخانوں کے بنے ہوئے ہونے چاہئیں +

مجھے خوب یاد ہے کہ سیاحت کے ابتدائی ایام میں مجھے گریٹ انڈین پینینسولر ریلوے[1] کے ایک معمولی جگہ کے اسٹیشن ماسٹر کی مہمان نوازی سے متمتع ہونے کا موقع ملا تھا۔ اسوقت مجھے یہ دیکھکر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اکثر انگریزی پادریوں کے مقابلہ میں بہتر حالت میں اور زیادہ وسیع مکان میں رہتا تھا۔ اُس کے علاوہ اس کے پاس اعلیٰ درجہ کی فٹن بھی تھی جسمیں دو نفیس گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ مگر درحقیقت تعجب کی کوئی وجہ نہ تھی

[1] Great Indian Peninsular Rly.

وہ اسی طریقہ سے رہتا سہتا تھا جس طریقہ سے سب انگریز ہندوستان میں رہنے کے خوگر ہیں - اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شان کے ساتھ اس کے مرتبہ کا آدمی انگلستان میں رہ سکتا ہے اس سے وہ پانچ گنی زیادہ شان کے ساتھ ہندوستان میں رہتا تھا. مگر یہ سمجھنا چاہئے کہ فاقہ زدہ ہندوستانی محض اس وجہ سے بہتر حالت میں ہیں کہ ان کے حکام شان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں - میں نے انگریز سیاح ہونے کی حیثیت سے بطور مہمان فائدہ اٹھایا اور مجھے یہ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے کہ مجھے کیسے کیسے لذیذ کھانے کھانے کا اتفاق ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غریب کسان میرا میزبان تھا - کیونکہ اسی کی گاڑھی کمائی کی بدولت مجھے اچھا کھانا ملا اگرچہ وہ خود اس کھانے میں شریک نہ تھا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک سیاح کھانوں کی بہتات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - دنیا میں یقیناً اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں فاقہ کشی کے ساتھ کھانے کی اس قدر چیزیں ضائع جاتی ہوں - اور ایسا ملک تو کوئی بھی نہیں ہے جہاں تمام اخراجات براہ راست غربا کو برداشت کرنے پڑتے ہوں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کسی نے کبھی ان ہزارہا میل لمبی سڑکوں کا تخمینہ لگایا ہے جو مختلف اینگلو انڈین چھاؤنیوں میں بنائی گئی ہیں اور جن کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ افسروں کی بیویاں اپنی گاڑیوں میں بیٹھکر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے چلی جایا کریں - کیا کبھی کسی نے ان قطعاً فضول گھنٹہ گھروں کا شمار کیا ہے جنھیں سر رچرڈ ٹمپل اور سر بارٹل فریر[1] کے ہم خیال گورنروں نے مختلف صوبجات میں تعمیر کیا ہے؟ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آیا کبھی کسی نے اس بات کا حساب لگایا ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں پانی پینے والے کسان نے شراب کے کتنے ایسے پیپوں کے لئے روپیہ ادا کیا ہے جنکا بجٹ میں کوئی تذکرہ نہیں؟ سیاح ان باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - لیکن ہندوستان میں رہنے والے (انگریز) اس سے متاثر نہیں ہوتے - یہ دلائل نہیں ہیں بلکہ محض اثرات ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ معنی پنہاں ہیں +

اگر ہندوستانی کسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے سے پیشتر اپنے انگریزی حکام کے آرام و آسائش کا خیال رکھے تو پھر اسے اپنی تجارت کو نقصان پہنچا کر انگریزی تاجروں کو برقرار رکھنا چاہئے - ہندوستانی شاکی ہیں کہ ہندوستان کے بجٹ مرتب کرنے والے کی راہ میں بشرطیکہ وہ دیانتدار شخص ہو - مانچسٹر کے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کا خیال ایک بہت بڑی رکاوٹ پیش کرتا ہے - اور یہ کہ اگرچہ ہر انگریزی نوآبادی کا وزیر مالیہ مال درآمد پر محصول بڑھا کر اخراجات کو پورا کر سکتا ہے، لیکن ہندوستانی وزیر اس ذریعہ آمدنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا - ہندوستانی ماہرین اقتصادیات نے میں نے آزاد تجارت پر بہت کچھ بحث کی ہے - وہ کہتے ہیں کہ انگلستان جیسے ملک کے لئے جہاں کھانے کی چیزیں باہر سے آتی ہیں، فری ٹریڈ[2] باقی زندگی کے لئے لازمی شے ہے - مگر ہندوستان پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا - ہندوستان ریاستہائے متحدہ امریکہ یا اسٹریلیا کی نوآبادی کے مانند اپنی پیداوار بھیجنے والا ملک ہے - کوئلہ اور لوہے کو اگر خارج کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مال درآمد میں کوئی ایسی شے شامل نہیں جو زندگی کے لئے نہایت ضروری ہو - روئی کی مصنوعات اور دیگر چیزیں بھی سامان تعیش میں شامل ہیں

---

[1] Sir Bartle Frere [2] Free Trade (آزاد تجارت)

صفر علی محمد علی تاجر عطر گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ایک شاخ موجود ہے

جن کا استعمال بالعموم امرا کرتے ہیں اور بالخصوص یوروپین اشخاص۔ یہ یقینی امر ہے کہ کوئی ہندوستانی کسان غیر ملکی کپڑا زیب بدن نہیں کرتا یا یہ کہ فری ٹریڈ ہوجانے سے اس کے ذرائع زندگی پہلے سے سستے ہوجائینگے۔ مال درآمد کے محاصل کا اثر صرف امرا پر پڑیگا اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر بہت ہی کم ٹیکس ہے۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ اس کی سیاسی ضرورت ہو تو ہو لیکن مالی اعتبار سے ہندوستان کو اس سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے دلائل میں مجھے کہیں خامی نظر نہیں آتی۔

وہ اس امر کی بھی شکایت کرتے ہیں کہ فری ٹریڈ نے ہندوستانی مصنوعات کا خاتمہ کردیا ہے اور اس کے بجائے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ سو سال پیشتر جب انگریزی دیہات میں چرخوں کا استعمال بند ہوگیا تو وہاں کی آبادی بڑے بڑے شہروں میں چلی آئی اور کارخانوں میں کام کرنا شروع کردیا لیکن ہندوستان میں اس قسم کی کوئی بات وقوع میں نہیں آئی جو لوگ خالی اوقات میں کپڑا بنا کرتے تھے، اب بیکار ہیں اس لئے کہ ان کے دیہات اور شہروں کے درمیان وسیع فاصلہ ہے اور دوسرے یہ کہ شہروں میں کافی کام موجود نہیں، لہٰذا وہ بیکار رہتا ہے۔ سستی سے سستی منڈی میں چیزیں خریدنے کے اصول سے اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ اُسے کوئی چیز سستی نہیں ملتی۔ اور اگر انگریزی کارخانہ دار کسی ہندوستانی کو اپنے فائدہ میں شریک کرتا ہے تو وہ شہر والے ہیں نہ کہ کسان وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی ہندوستانی ماہر اقتصادیات سے میں نے گفتگو کی ہے وہ یہی رائے رکھتا ہے کہ مشنری (کلوں) کے سوائے باقی سب قسم کے مال درآمد پر محصول بڑھا دیا جائے۔ اس طرح سے مالداروں پر ٹیکس لگ جائیگا اور اگر اس سے دیسی مصنوعات کو ترقی دینے کا خیال پیدا ہوگیا تو اور بھی اچھا ہے۔ ہندوستانی تجارت کے متعلق حفاظتی پالیسی نافذ کردینے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ شہروں میں کارخانے قائم ہوجائینگے جہاں دیہات کے بیکار لوگ آکر کام کرسکیں گے اور اب تک جو نقصان ہوچکا ہے اس کی کسی حد تک تلافی ہوسکیگی۔ اگر یہ اصول غلط ہے تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ غلطی کہاں کی گئی ہے[له]۔

مجھے بمبئی والے جلسہ میں جسکا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ سب اس امر کے موید تھے کہ کسی نہ کسی قسم کا انکم ٹیکس لگایا جائے وہ اس بات سے غافل نہ تھے کہ عام لوگ اسے پسند نہیں کریں گے بلکہ وہ ضروری سمجھتے تھے کہ دولت پر ٹیکس عاید کیا جائے وہ کہتے ہیں کہ موجودہ لائیسنس ایکٹ[٥٢] نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انکم ٹیکس کے مقابلہ میں بہت کم نفع کی چیز ہے۔ یہ امر ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی حصہ شہر میں ایک چھوٹی سی دوکان کے مالک کو اپنے سامان تجارت پر اتنا ہی ٹیکس دینا پڑتا ہے جتنا کہ ایکسچینج[٥٣] میں کسی انگریزی مہاجن کو۔ موخر الذکر کا کاروبار خواہ کروڑوں کا ہو اسے وہی بیس پونڈ کی رقم تجارت کے لائیسنس[٥٤] کے لئے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہندوستانی بجٹ مرتب کرنے والے اس قاعدہ سے انگریزی تجارت کو اور زیادہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جو لوگ درحقیقت انکم ٹیکس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی تاجر نہیں ہیں بلکہ انگریز افسر ہیں کیونکہ ان پر اس کا براہ راست اثر پڑیگا۔ اگر مال درآمد

له ان سطور کو لکھنے کے بعد سے بمبئی میں ہندوستانیوں کے چند کپڑا بننے کے کارخانے قائم ہوگئے ہیں لیکن ان کے لئے قوانین ایسے وضع کئے گئے ہیں جنکے باعث وہ لنکاشائر کے مال کا مقابلہ نہیں کرسکتے لارڈ کرزن نے بھی اسی غرض سے مصر میں مقابلۃً محاصل جنگی عاید کئے تھے۔ ٥٢ license act ٥٣ [illegible] ٥٤

ماہرین عطر کے بنانے والے کافی تعداد میں کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ میں ملازم ہیں

اور آمدنیوں پر ٹیکس لگا دئے جائیں تو غریب زراعتی آبادی کو قدرے آرام پہنچیگا لیکن کسی اور طریقہ سے یہ بات ممکن نہیں۔

زراعتی اصلاح کے بارے میں جس قانون کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جسکے متعلق تمام ہندوستان متفق ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح ۱۰۰ سال پیشتر بنگال میں بندوبست دوامی کر دیا گیا تھا اور اس کے ذریعہ گورنمنٹ کے غیر واجبی حقوق ملکیت کو محدود کر دیا گیا تھا اسی طرح تمام ہندوستان میں اس کا رواج کر دیا جائے جہاں جہاں حکومت کے حق ملکیت کا استعمال کیا گیا ہے وہاں مفلسی اور بے چینی پھیل گئی ہے اور صرف بنگال ہی (جہاں اس کا عمل درآمد نہیں ہے) خوش حال حالت میں ہے۔ میں اس مسئلہ پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔ اس مقام پر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بنگال ریننٹ بل کے خلاف جو زبردست شورش آج کل کیجارہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ بندوبست دوامی کے حامی ہو گئے ہیں۔ یہ قانون لارڈ رپن کی غیر معمولی ہردلعزیزی کے باوجود نہایت غیر ہردلعزیز رہا ہے اور ہندوستانی سیاست داں یہ سمجھتے ہیں کہ جو واحد صوبہ شاہی خزانہ میں اپنی دولت جمع کرنے سے ابتک بچا رہا ہے اس کی خوشحالی کو قانون ہذا کے ذریعہ نقصان پہنچانے کی کوشش کیجارہی ہے میں بھی یقین کرنے پر مائل ہوں کہ لارڈ رپن نے تو نہیں لیکن اُن کے بعض مشیروں کا ایسا ارادہ ہوگا۔ فی الحال میں اتنا بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ تمام ہندوستان بندوبست دوامی کا سخت مطالبہ کر رہا ہے[1]۔ ہندوستانی ماہرین اقتصادیات مختصراً یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس طرح سے اسٹریلیا اور دیگر نو آبادیوں میں بیرونی مصنوعات کی درآمد پر محصول لگایا جاتا ہے اسی طرح سے ہندوستان میں بھی عاید کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مالی بوجھ کو غریب زراعتی آبادی سے ہٹا کر مالدار تجارت پیشہ لوگوں پر منتقل کر دیا جائے تیسرے گورنمنٹ زمین کے متعلق اپنے دعاوی سے دست بردار ہو جائے ممکن ہے کہ انگلستان میں ان خیالات وجذبات کو مہمل و بے معنی قرار دیا جائے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ہندوستانی رائے ہمارے خلاف ہے اور ہمارے اصول کفایت شعاری کے سبب ہندوستان دن بدن تباہی کے قریب آتا جاتا ہے۔ بلاشبہ موجودہ صورت حالات میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور مضمر ہے اس لئے کہ گورنمنٹ ملک کی تمام مالگذاری ہضم کرنے کے بعد بھی اپنے تئیں مالی مشکلات میں پاتی ہے زمین کا اصلی مالک ہونے کی حیثیت سے گورنمنٹ زمین کے لئے کچھ نہیں کرتی تمام روپیہ اور امور پر ضایع کر دیا جاتا ہے اور جو لوگ زمین کی کاشت کرتے ہیں وہ سال بسال زیادہ غریب اور نا امید ہوتے جاتے ہیں اسی کو میں زراعتی خطرہ سے تعبیر کرتا ہوں

نوٹ:۔ اس مضمون کے سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہونے کے بعد سے نمک کے غیر منصفانہ محصول میں کچھ کمی کر دی گئی ہے۔ لیکن دیگر اقتصادی خرابیاں بدستور قائم ہیں مال درآمد پر ٹیکس لگانے سے دیسی مصنوعات کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور بندوبست دوامی ہی منظور کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ اس اصول کو مصر میں مساوی حالات کے ماتحت زراعتی خوشحالی برقرار کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی ہے۔ ہر وائسرائے یہی لکھتا چلا آیا ہے کہ قحط اقتصادی اسباب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ "خدائی فعل ہے" کیونکہ وہی بارش کو روک دیتا ہے۔ امپیریل اخراجات کم نہیں کئے گئے اور کسانوں پر سے انفرادی قرض کا بوجھ ہلکا کیا گیا ہے جس کی پوزیشن برطانوی ہندوستان کے اکثر حصہ میں حکومت کے اسامی کی سی ہے جسے اپنی زمین کی قیمت کے مساوی لگان دینا پڑ جاتا ہے +

ض-ا-ب-برنی

---

[1] میرا خیال ہے کہ سرجان اسٹریچی یہ چاہتے تھے کہ جس طرح سے بھی بن پڑے، مالیات کے مفاد کی خاطر بنگال کے بندوبست دوامی کو منسوخ کر دیا جائے +

بڑھیا عطر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

استفسارات

غالب کی مثنوی نگاری

(جناب سید بدر عالم صاحب ۔ شاہ پور)

کچھ عرصہ سے آپ کے رسالہ میں "غالب کے ذوق فارسی" پر ایک مسلسل مضمون غلام ربانی صاحب عزیز کا نکل رہا ہے جس میں ایک وقت تک اس کی مثنوی نگاری سے بحث کی گئی ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بحث تمام ہوگئی یا باقی ہے، لیکن ابھی ناتمام ہے تو بھی میرا جہاں تک خیال ہے ۔ جناب عزیز ربانی اس بحث کو چھیڑتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے کہ مثنوی نگاری میں غالب کا سب سے بلند کارنامہ کیا ہے اور کن اسباب کی بنا پر اسے ایسا کہا جا سکتا ہے ۔

مجھے افسوس ہے کہ آپنے اس سلسلہ میں کبھی کوئی نوٹ نہیں دیا اور نہ اپنی رائے اس مضمون کے متعلق ظاہر کی تاکہ اسی سے کچھ اس حقیقت پر روشنی پڑتی بہر حال اب میری خواہش یہی ہے کہ آپ مطلع فرمائیں کہ غالب نے اپنی مثنویوں میں کس جگہ اور کیا امتیاز پیدا کیا ہے اور اس صنف میں اس کا شاہکار کیا ہے ؟

(نگار) غالب کے ذوق فارسی کے متعلق مولوی غلام ربانی صاحب عزیز کا مضمون ابھی ختم نہیں ہوا لیکن مثنوی کے نسبت انھیں جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکے ہیں ۔ آئندہ قصاید و رباعیات سے بحث کی گئی ہے اس لئے اگر اس مضمون کے شائع شدہ حصہ کو آپ تشنہ پاتے ہیں، تو تشنہ ہی رہیگا ۔

میں نے بیشک کوئی رائے اپنی ظاہر نہیں کی تھی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میرا یہ سکوت برابر قائم رہتا ۔ خیال تھا کہ جس وقت یہ مضمون مکمل ہو جائے گا، اسوقت اسپر تبصرہ کرونگا لیکن آپ کی بیتابی نے مہلت نہ دی اور میرے عہد انتظار کی مدت کو مختصر کر دیا ۔

مولوی غلام ربانی صاحب نے اس وقت تک غالب کی فارسی مثنویوں کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، وہ یقیناً "آخری لفظ" تو نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن ایسی حالت میں کہ لوگ اس کے اردو کلام کی طرف سے کسی طرح ہٹتے ہی نہ تھے اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت برداشت ہی نہ کرتے تھے کہ غالب حقیقتاً غالب کہاں نظر آتا ہے ۔ انھوں نے ایک ایسا نغمہ چھیڑا جو بالکل برمحل تھا ۔ میں نے اس مضمون کی اشاعت اس لئے نہیں کی تھی کہ اسمیں اب کسی کلام کی گنجائش نہیں، بلکہ برخلاف اس کے مقصود یہی تھا کہ لوگوں کو "کلام" کا موقع ملے اور وہ نگاہیں جو اس کے صرف دیوان اردو پر جمی ہوئی ہیں، کسی طرح دوسری طرف بھی مائل ہوں ۔ چنانچہ ایک مثال آپ ہی کی ہے کہ اس مضمون کو دیکھ کر یہ استفسار آپ کے ذہن میں پیدا ہوا اور مجھے بھی لب کشائی پر مجبور کیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر خرید نا چاہئے

جب کسی شاعر کا کلام ہمارے سامنے ہوتا ہے تو ہم اس کی قوت شاعری کا اندازہ یا اُس کا صحیح میلان طبع جن اصناف سخن کو دیکھکر معلوم کرتے ہیں وہ غزل، قصیدہ اور مثنوی ہیں (قطعہ، رباعی کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ محض قطعات و رباعیات کے لحاظ سے شہرت حاصل کرنے والے کم ہیں اور ایسے تو بہت ہی کم ہیں جن کے عمر کا ماحصل صرف یہی ہو) اور انھیں کا ذخیرہ اردو فارسی میں کثرت سے موجود ہے۔

میں کسی طرح ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ایک شاعر ان تینوں اصناف سخن میں یکساں قدرت رکھ سکتا ہے کیونکہ بہ لحاظ شعر ہونے کے جس طرح یہ تینوں ایک ہی چیز نظر آتی ہیں، اسی طرح اپنے داعیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے منافی بھی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا مقصود علیٰحدہ ہے اور مقصود کی علٰحدگی حقیقتاً خیال کی علٰحدگی، زبان کی علٰحدگی ہے۔

قصیدہ و غزل کے فرق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا ایک کامیاب قصیدہ گو فیلسوف ہو سکتا ہے، خلاق معانی ہو سکتا ہے، ماہر لسانیات ہو سکتا ہے اور اگر اس کے دماغ کو مادی دنیا کے مطالعہ کا موقع ملے تو ایک کامیاب تاجر ہوشیار ماہر سیاست اور موجد و مخترع بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس سے ہمدردی کی توقع رکھنا اس کے اندر جذبۂ ایثار و قدوسیت کی جستجو کرنا، یا اس کا دوستی اخلاق کی طرف مائل ہونا۔ اور دنیا میں اپنے آپ کو رحمت و برکت کی صورت سے پیش کرنا خلاف عقل ہے۔ اسی طرح ایک اچھا غزل گو، محبت میں قربانیاں کر سکتا ہے۔ ایک مفید متمدن انسان بن سکتا ہے۔ روحانیت میں ترقی کر کے وہ ایثار کرنے والا مصلح اور اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر دوسروں کے لئے امن و سکون کی راہیں نکالنے والا مرد صالح بن سکتا ہے، لیکن اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ مادی ترقی کی راہیں سوچے، سیاسیات میں ترقی کرے اور علوم و فنون کی اعانت کرے بالکل عبث ہے

پھر جب ان دونوں کی راہیں اس قدر علٰحدہ علٰحدہ ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک کامیاب قصیدہ گو، کامیاب غزلگو اور اچھا غزل کہنے والا اچھا قصیدہ خوان ہو سکتا ہے۔ خاقانی کا سارا کلام پڑھ جائے۔ انوری کا سارا کلیات ختم کر جائے لیکن سعدی کی ان دو شعروں میں کسی ایک مصرع کا بھی جواب آپ کو نہ ملیگا۔

سرو سیمینا بصحرا میروی نیک بدعہدی کہ بے ما میروی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

خاقانی، غم عشق کا ذکر بھی کرتا ہے تو ان الفاظ میں۔

غم تخم خرمی ست کہ در یکدل افگنم در دلیست جنس من کہ بیک دانہ آدم

کہ اگر حقیقتاً کسی پر کوئی کیف محبت طاری ہو تو بھی اس شعر کو سنکر فوراً دور ہو جائے۔ الغرض قصیدہ و غزل کے معیار بالکل جدا جدا ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو اچھی غزل کہ سکتے ہیں کیونکہ قصیدہ گوئی کی جرأت کرتے ہیں یا قصیدہ میں کامیاب ہونے والے غزل کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے۔

جس طرح قصیدہ و غزل کے لئے الگ الگ رنگ طبیعت درکار ہے، اسی طرح مثنوی کے لئے بھی خاص دماغ چاہئے۔ مثنوی چونکہ بالکل مسلسل نظم ہوتی ہے اور اس میں واقعات سلسلہ کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں اس لئے اسمیں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو نہ صرف تمام مطالعہ جزئیات پر قادر ہے بلکہ بغیر کسی غیر ضروری رنگ آمیزی کے ان کو ظاہر کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے، کیونکہ اگر اس میں مبالغہ وغیرہ سے کام لیا گیا تو واقعات کی اصلی ہئیت خراب ہو جائیگی اور مثنوی کا حسن غارت۔ اس کے لئے ایک ایسے نقاش و مصور کی ضرورت ہے جو مختلف رنگوں کے امتزاج سے واقف ہونے کے بعد ان کو متمائز بھی کر سکتا ہے، اور اس امتزاج و تفریق کے اظہار و بیان پر بھی قادر ہے۔ اسی لئے مثنوی کی زبان کا سادہ اور اس کی تشبیہات کا سریع الانتقال الی الذہن ہونا بالکل ضروری ہے اس میں مغلق و دشوار الفاظ، پیچیدہ ترکیبوں کا پایا جانا بالکل ایسا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے جیسے گرمی کی خنک، چاندنی رات میں چاند کے اوپر بادل کا چھا جانا۔

اس مختصر بیان سے غالباً یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ غزل، قصیدہ، مثنوی کی شاعری میں کیا فرق ہے اور ان تینوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ کن خصوصیات کا شاعر ہونا چاہئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ شبہہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بعض ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جنھوں نے قصیدہ، مثنوی اور غزل ہر ایک میں درجۂ قبول حاصل کیا ہے اور ایسے تو شاید متعدد ہیں جنھوں نے قصیدہ و غزل دونوں میں شہرت حاصل کی اس لئے اگر ان تینوں کے لئے اس قدر متباین طبائع درکار ہیں تو پھر اس جمع اضداد کے کیا معنی۔ یہ شبہہ ایک حد تک بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً نادرست ہے، کیونکہ اگر ایسے شعراء کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ وضع تو ہوئے تھے صرف ایک ہی صنف سخن کے لئے لیکن کسی ایسی خصوصیت نے جو عمومی طور پر سامع کے ذہن و خیال کو متوجہ کر سکتی ہے ان میں پائی جاتی تھی اور اس کے اشتراک نے ان کے تمام اصناف سخن کو فی الجملہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ علاوہ اس کے بعض ایسے شاعر بھی ہوتے ہیں جو قدرت کی طرف سے کسی صنف سخن کے لئے مخصوص دماغ لیکر نہیں آتے اور سب میں دخل دے سکتے ہیں، پھر چونکہ ان کا ذہن بہت رسا اور محل شناس ہوتا ہے اس لئے وہ ہر موقع کی خصوصیات کا لحاظ کرکے اپنے لئے کچھ نہ کچھ امتیاز پیدا ہی کر لیتے ہیں، یا پھر ان میں کوئی ایسی خاص بات ہوتی ہے جس کا اظہار ہر صنف سخن میں اک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے شاعروں کے تسمیہ کے لئے انگریزی کا ایک لفظ (Factotum) بہت موزوں ہے (جسکا ترجمہ فوربس نے ہرگناہ ہربابی یا ہرکارہ کیا ہے)

اس کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ موسیقی داں طبقہ میں ایک جماعت دہرپدیوں کی کہلاتی ہے جو صرف اصولی طور پر ایک خاص گانے کی مشق کرتے ہیں اور اسی میں انکی زندگی صرف ہو جاتی ہے، بعض صرف خیال گاتے ہیں، بعض ٹھمری اچھی طرح ادا کرتے ہیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو دُھرپد، خیال اور ٹھمری تینوں میں دخل رکھتے ہیں اور ان کی قدرتی خوش گلوئی کا اثر ہمیں اس قدر مسحور کر لیتا ہے کہ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ شخص حقیقتاً ماہر کس چیز کا ہے۔ بالکل یہی حال بعض شاعروں کا ہے کہ ان کی رنگین بیانی، یا اسلوب ادا، یا کوئی ایسی ہی اور خصوصیت ہم کو اس درجہ متاثر کر لیتی ہے کہ ہم اُسے ہرگنا سمجھنے لگتے ہیں، یا یہ کہ اس پر غور ہی نہیں کرتے۔

عطر و عرق کارخانہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خریدئیے

مثلاً سعدی اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے یا خاقانی اور انوری قصیدہ گوئی کی حیثیت سے بالکل ایک ایسے دہر یدیے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں کوئی اور خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ان کو موسیقی کے کسی اور صنف میں کامیاب بنا سکے، برخلاف اس کے امیر خسرو، عرفی اور غالب اس گوئے کی طرح ہیں جسکی خوش گلوئی اُسے ہر رنگ میں کامیاب کرکے دکھا دیتی ہے۔ حالانکہ وہ باہر کسی کا نہیں ہے یا صرف ایک چیز کا ہے

آپ نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا اور اس کے قصاید کو دیکھ کر یہ حکم لگایا ہوگا کہ یہ قصاید ہی کے لئے وضع ہوا تھا، حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی میرے نزدیک وہ صرف رنگیں غزلگوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ (صحیح تغزل سعدی کا اس کے ہاں بھی نہیں ہے) لیکن چونکہ زبان کی رنگینی، خیال کی لطافت، اسلوب بیان کی ملاحت ایک ایسی چیز ہے جو بنا اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی اس لئے ایک شخص اس کے قصاید میں ان خصوصیات کو دیکھ کر یہی سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ یہاں ایک شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عرفی صرف غزلگو شاعر تھا تو اس کا دیوان کیوں پھیکا ہے۔ لیکن اس کا سبب صرف یہ تھا کہ زمانہ کی ضرورت نے اسکو مجبور کیا تھا۔ وہ قصاید ہی کی طرف توجہ کرے اور اپنے کمال کی قوت کو اس صنف میں ظاہر کرے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوا اور تمام وہ رنگینیاں، تمام وہ حلاوتیں، تمام وہ لوچ جو ایک غزل ہی کے لئے زیادہ موزوں ہیں اس کے قصاید میں پیدا ہو گئے۔ پھر یہ آپ کو اختیار ہے کہ اس کی ان نظموں کو آپ قصاید کہئے یا کچھ اور لیکن میں تو اس کے قصاید کو ہمیشہ غزل سمجھ کر لطف اٹھاتا ہوں۔

عرفی کے وہ قصاید جن میں سے قصیدہ کا تمام شوکت و دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے صرف چند ہیں لیکن وہ اپنی فطری غزلگوئی سے یہاں بھی مجبور ہوگیا۔ انھیں چند میں سے اس کا ایک قصیدہ نعت میں ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

سپیدہ دم چو زدم آستین بہ شمع شعور ۔۔۔ شنیدم آیہ استنقحوا از عالم نور

اور یقیناً قصیدہ کا خالص رنگ رکھتا ہے، لیکن دوسرے ہی شعر سے فوراً یہ رنگ اس طرح تبدیل ہو جاتا ہے۔

بدل ز شاہد بزم ازل ندا آمد ۔۔۔ کہ اے تمام وفا از رضائے مابس دور

زہے اطاعت حسن ادب خہے طاعت ۔۔۔ کہ با اجازت مائی ز وصل ما مہجور

زیادہ زیں نہ حلاست دوری از بر ما ۔۔۔ اگر بجو صلہ تازی در آ بہ بزم حضور

طلب بیار و مترس از امتناع منع کلیم ۔۔۔ بساط عذر میارا کہ نیستی موزور

اگر کرشمۂ مقصود دست عشوۂ ما ۔۔۔ شکست ساغ امید او بسنگ فتور

نہ کوتہی ز عطا بود عشق میداند ۔۔۔ کہ ہر کرشمۂ ما ننگ بود خلعت طور

اسی طرح کا ایک دوسرا نعتیہ قصیدہ ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را ۔۔۔ ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

ہر قسم کے روغن اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے

کیسا پُر شوکت شعر ہے، لیکن دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

از رغبت دنیا الم آشوب نکردم — زین باد پریشاں نکنم زلفِ الم را

زلف کا خیال آہی گیا، اس سے زیادہ لطف وہاں پیدا ہوتا ہے جب اسی قصیدہ میں آگے چلکر وہ حدوث و قدم کے ایسے خشک الفاظ کا استعمال اس طرح کرتا ہے۔

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل — سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

یہاں بھی اس کا کام بغیر سلمیٰ اور لیلےٰ کے ذکر کے نہ چلسکا۔

یہ حال ان قصاید کا ہے جہاں وہ حدود غزل گوئی سے بہت بچکر گیا ہے، لیکن جو قصاید اُس نے پوری تغزل کی کیفیت پیدا کر کے کہے ہیں وہاں تو ان جواہر پاروں کا انبار نظر آتا ہے۔ آپ نے اس کا وہ مشہور قصیدہ دیکھا ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

جہاں بگردم و دردا بہیچ شہر و دیار — نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور اسمیں آپنے ان قسموں سے بھی لطف اٹھایا ہوگا جو عرفی نے کھائی ہیں، پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ کیا غزل کے لئے اس سے زیادہ کسی اور کیفیت کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے وہ خدا کی قسم کھاتا ہے لیکن اس انداز سے:-

بداں خدائے کہ در شہر بند امکان نیست — متاع معرفتش نیم ذرہ در بازار

اس کے بعد وہ اور چند قسمیں کھاکر آخر کار ان قسموں پر آجاتا ہے:-

بہ عشوۂ کہ زلیخا بُرید از وکف دست — بہ فتنۂ کہ مسیحا گزید از و سر دار

بہ برقعِ مہ کنعاں کہ بود حسن آباد — بہ حجلہ گاہِ زلیخا کہ بود یوسف زار

بہ آن متاع کہ گوہر فروشِ کنعانی — بمصر بُرد و لبالب ز حسن شد بازار

بہ آن دروغ کہ فرہاد از و شہادت یافت — بہ آن ترانہ کہ منصور را کشید بدار

بہ ناقۂ کہ بہ لیلےٰ خیال مجنوں بُرد — بہ آن کرشمہ کہ لیلی بر آن نمود نثار

بہ تیشۂ کہ بر اطراف صورت شیریں — ہمہ کرشمہ تراشید و ریخت بر کہسار

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار غزل نہیں ہیں۔ دوسرے قصیدوں کے اور چند اشعار ملاحظہ کیجئے:-

دمیکہ لشکرِ غم صف کشد بخونخواری — دلم بنالہ دہد منصب علمداری

خراب نرگس مستانۂ توام کہ دہد — ہزار شیوۂ مستی بہ طبع ہوشیاری

....

بڑھیا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے۔

دراں دیار بہ سودا ارود دلم کہ دہند — جوے ملال بہ عمرِ ابد بہ بسیاری

از درِ دوست چگویم بچہ عنواں رفتم — ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم
دل و دین و خرد و ہوش و زبان بازم دہ — تا بگویم ز درِ دوست بہ ساماں رفتم

......

منم آں غنچۂ پژمردہ کہ از بادِ خزاں — خندہ برلب گرہ در سر بہ گریباں رفتم

بیا کہ با دلم آں می کند پریشانی — کہ غمزۂ تو نکرد ست با مسلمانی
ز دیدہ رفتی و مردم ہماں نفس فریاد — کہ بے تو مردم دا نگہ چنیں بآسانی
کسے کہ تشنہ لبِ نازنست میرہ اند — کہ موجِ آبِ حیات ست چینِ پیشانی
نہ ہشت غمزۂ اسلام دشمنت کہ دو روز — محبتِ تو کنم جمع با مسلمانی

......

متاعِ حسنِ تو سرمایۂ تہیدستی — خیالِ زلفِ تو مجموعۂ پریشانی
لبِ تو جرعہ دہ بادۂ دل آشوبی — غمِ تو شانہ کشِ طرۂ تن آسانی
گل کرشمہ بخندد چو چشم باز کنی — بہار عشوہ بریزد چو رخ بپوشانی

باز گلبانگ پریشان می زنم — آتشے در عندلیباں می زنم
حجلۂ گل بہر من بستند و من — سر بدیوار گلستاں می زنم

میرے نزدیک یہ اشعار اور اسی قسم کے سیکڑوں شعر جن سے "قصایدِ عرفی" بھرا پڑا ہے بالکل رنگین غزلگوئی کے تحت میں آتے ہیں۔ یہ سلسلۂ کلام میں خدا جانے کہاں سے کہاں ہو گیا، بہر حال مدعا یہ ہے کہ بعض شاعر اپنے کلام میں بعض ایسی خصوصیات رکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ انکا صحیح رنگِ طبیعت کیا ہے، مشکل ہو جاتا ہے اور میری رائے میں غالب بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جزوِ اعظم اس کے کلام کا بھی یہی رنگین بیانی ہے اور یہی اس کے کامیابی کا راز ہے۔ ورنہ حقیقتاً وہ غزلگو تھا اور نہ قصیدہ گو، مثنوی تو خیر چیز ہی اور ہے قصاید میں اس نے بالکل عرفی کی تقلید کی اور اپنی مکمل تقلید کہ

صغر علی محمد علی تاجرِ عطر لکھنؤ سے تمباکو خوردنی و کشیدنی منگائیے۔

شکل سے دونوں میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود بھی اس کو محسوس کرکے کہتا ہے :۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب — جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

غزل میں اس نے نظیری اور بیدل کے رنگ کو اعتدال کے ساتھ ملا کر پیش کیا اور اس حسن کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا بیدل سے فائدہ اٹھانے کا اعلان اس نے اپنے اردو دیوان میں کیا ہے اور نظیری کی پیروی کو یوں ظاہر کرتا ہے :۔

زفیض نطق خویشم بانظیری ہمزبان غالب — چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

مدعا یہ کہ جو شمع نظیری کی ذات سے روشن تھی اسے اب غالب نے روشن کیا ہے

اب رہا مثنوی کا مسئلہ، سو میں بلا تامل کہوں گا کہ غالب مثنوی کہنے کے لئے وضع نہ ہوا تھا اور نہ صحیح معنے میں اس نے کوئی مثنوی کہی، لیکن چونکہ بادۂ شیراز کی اس کے ہاں کمی نہ تھی اس لئے مثنوی کے نام سے بھی اس نے جو کچھ کہا وہ رنگ و کیفیت سے خالی نہ رہا۔

کلیات غالب میں گیارہ مثنویاں نظر آتی ہیں جنھیں دس تو ایسی ہیں جو بہت مختصر ہیں اور جن کا موضوع مدح، تقریظ اور اعتراض، تہنیت وغیرہ ہے جنھیں مثنوی سے کوئی علاقہ نہیں۔ گیارہویں مثنوی جس کا عنوان ابر گہر بار ہے بیشک طویل بھی ہے اور موضوع و ترتیب کے لحاظ سے بھی مثنوی کے تحت میں آتی ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، مناجات، حکایت، ساقی نامہ، مغنی نامہ سبھی کچھ ہے اور غالب کی طرف سے اگر کوئی کامیاب نمونہ مثنوی کا پیش کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے

حمد و نعت یا مناجات کے لئے جس عجز و فتادگی کی ضرورت ہے وہ بیشک اس کے کلام میں پیدا نہیں ہوئی کیونکہ یہ اس کا رنگ نہ تھا لیکن جہانتک کہ جذبات کی بلندی، خیال کی پاکیزگی، زبان کی حلاوت کا تعلق ہے وہ ان میں بھی پائی جاتی ہے۔ مگر اس مثنوی کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں محشر کا منظر پیش کرکے خدا کے سامنے اپنی شکایات کا دفتر کھولا ہے۔

ایک شاعر کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہوتا ہے جہیں وہ بے اختیار ہو کر اپنے آپ کو ظاہر کرنے لگتا ہے اور مثنوی کی اس وجہ میں غالب نے اپنے آپ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس سے غالب کی زندگی کے تمام جذبات کا مطالعہ بیک وقت کر سکتا ہے۔ محشر میں نیکوں اور بدوں کے اجتماع کے ساتھ اپنے وجود کا ذکر کرتا ہے :۔

بروزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
روان را بہ نیکی نوازندگان — بسرمایۂ خویش نازندگان
گہرہائے شہوار پیش آورند — فروہیدہ کردار پیش آورند
زنورے کہ ریزند خرمن کنند — جہان را بجز دچشم روشن کنند
بہ ہنگامہ باایں جگر گوشگان — در آیند مشتے جگر تشنگان

عطر ملنے کا پتہ اپنی نوٹ بک میں ابھی درج کر لیجئے، جعفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

زحسرت بدل بردہ دنداں فرو   زخجلت سراندر گریبان فرو
درآن حلقہ من باشم وسینۂ   زغمہائے ایام گنجینۂ
درآبے درآتش بسر بردۂ   زدشواریِ زیستن مردۂ

اس کے بعد اور بہت سے شعر لکھ کر کہتا ہے :-

حساب مے ورامش ورنگ بوے   زجمشید وبہرام وپرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ ! فروختند   دل دشمن وچشم بد سوختند
نہ ازمن کہ از تابے گاہ گاہ   بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

یعنی کہاں تک ضبط کروں دل خون ہوگیا، اور پھر یوں بھی جب تو بغیر کہے سب کچھ جانتا ہے تو نہ کہنے سے کیا فائدہ۔ تجھے معلوم ہے کہ میں کافر ہوں نہ گبرو ترسا نہ میں نے کسی کا خون کیا، نہ راہزنی کی۔ البتہ اگر کوئی قصور ہوا ہے تو صرف یہ کہ شراب پی ہے، سو اس کا مواخذہ اگر کرنا ہے تو جمشید وبہرام وغیرہ سے ہونا چاہئے جن کی عمر ہی اسکی لطف میں بسر ہوگئی نہ میں کہ اگر کبھی مجبور ہو کر پی بھی تو گدائی کر کے اور اس شان کیساتھ کہ :-

نہ بستان سرائے نہ میخانۂ   نہ دستاں سرائے نہ جانانہٗ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط   نہ غوغائے رامشگراں در رباط

اس کے بعد وہ اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا جانے کتنی بہاریں، کتنی برساتیں اور کتنی چاندنی راتیں بے سروسامانی اور بادہ نوشی کی حسرتوں میں گزر گئیں، اگر کبھی کوئی سامان مہیا ہوا بھی تو "رقص بسمل" کی طرح ناپائدار، نہ دنیا میں مجھے کوئی ایسا قدردان بادشاہ ملا جو مجھے مالامال کر دیتا نہ کوئی ایسا معشوق ملا جو اسباب لطف پیدا کر دیتا۔ غالب کے الفاظ یہ ہیں :-

بسا روزگاراں بدلدادگی   لب نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باران وشبہائے ماہ   کہ بود ست بے مے بہ پیشم سیاہ
انقہا پُر از ابر بہمن مہی   سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاران ومن در غم برگ وساز   درخانہ از بینوائی فراز
جہان از گل ولالہ پُر بو ورنگ   من وحجرۂ ودامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نبود   باندازۂ خواہش دل نبود
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست   وگر یافتم بادہ ساغر شکست

....

افشانی تو ام صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے اور ہر قسم کی اشیا مل سکتی ہیں

بہ گیتی درم بے نوا داشتی دلم را اسیر ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد بہر بار زر چل بارم دہد

نہ نازک نگاہے کہ نازش کشم بہر بوسہ زلف و رازش کشم

اس کے بعد وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں فردوس میں گیا تو بھی وہاں کیا خاک لطف آئے گا۔ اگر وہاں صبوحی پی بھی تو جام بلور، زہرۂ صبح اور ابر کا جھوم جھوم کر آنا کہاں؟ حور ملی بھی تو اس سے کیا لطف۔ معشوق کے ملنے کا لطف یہ ہے کہ پہلے اس سے فراق ہو، ہم بلائیں وہ گریز کرے، قسمیں کھائے اور وعدہ پورا نہ کرے اس کے علاوہ فردوس میں نظر بازی کا بھی کوئی لطف نہیں اور نہ وہاں دیوار میں کوئی روزن کہ اس سے جھانک تانک کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

غالب اس خیال کو جس تاثر و کیفیت کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کا حسن اسی کے الفاظ میں دیکھنا چاہئے:-

چو آن نامرادی بیاد آیدم بفردوس ہم دل نیاسایدم

دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شراب طہور کجا زہرۂ صبح و جام بلور

دم شبرد ہیاہوے مستانہ کو بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو

سیہ مستی ابر و باراں کجا خزاں چوں بناشد بہاراں کجا

اگر حور، در دل خیالش کہ چہ غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار چہ لذت دہد وصل بے انتظار

گریزد دم بوسہ اینش کجا فریبد بہ سوگند دینش کجا

برد حکم و نبود بیش تلخ گوئے دہد کام و نبود دلش کام جوئے

نظربازی و ذوقِ دیدار کو بفردوس روزن بدیوار کو

نہ چشم آرزومند دلالۂ نہ دل تشنۂ ماہ پر کالۂ ہو

اس کے بعد کہتا ہے کہ پھر جب میری حسرتوں کا اور ناکامیوں کا یہ عالم ہوگا تو

بفرمائے کایں داوری چوں بود کہ از جرم من حسرت افزوں بود

مثنوی کے اس قصہ میں گویا غالب نے اپنے اس شعر کی تفسیر بیاں کی ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک عطر کئی من کی تعداد میں تیار ہوتا ہے کارخانہ صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

یا یوں کہئے کہ مثنوی کے اس حصہ کا خلاصہ اس شعر میں بیان کیا ہے

قصیدہ ہو یا غزل، غالب بادہ نوشی اور اس کے متعلقات کے بیان میں خاص ملکہ رکھتے تھے اور اسی لئے مثنوی میں جب یہ قصہ آگیا تو انھوں نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا

غلام ربانی صاحب عزیز کی نگاہ میں غالباً اس حصہ کی طرف نہیں گئی۔ ورنہ وہ ضرور اس کی طرف توجہ کرتے یا ممکن ہے کہ انھوں نے اس کو توجہ کے قابل نہ سمجھا ہو، بہرحال میرے نزدیک غالب کی مثنویوں میں کوئی ٹکڑا اس سے بہتر نہیں ہے، ورنہ یوں تو وہ جس رنگ کا شاعر تھا اس کی جھلک ہر جگہ اور ہر شعر سے ظاہر ہے خواہ وہ قصیدہ ہو یا غزل، قطعہ ہو یا رباعی

بادۂ ناب۔ مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عہ
مطالبہ فطرت۔ مجلد اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک بےمثل تصنیف عہ
عروس ادب۔ حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ عاہ
سالومی۔ اسکر وائلڈ کا نہایت مشہور ڈراما مترجمہ مجنوں گورکھپوری ۱۲
نمکدان فصاحت۔ عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف عہ
تذکرہ حضرت بلھے۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے قیمت صرف ۸ر
جہان آرا بیگم۔ شاہزادی جہان آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند تاریخ قیمت صرف ۸ر
بندگی۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بےمثل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی بےنظیر کتاب قیمت ۱۰ر
کاس الکرام۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے قیمت ۳ر
خلق عظیم۔ یعنی اخلاقی مضامین بر احادیث نبوی کا ایک مکمل مجموعہ مجلد عہ
فتنہ خلق قرآن۔ امام عبد العزیز بن یحییٰ کی کتاب الجیدہ کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بےنظیر محاکمہ قیمت صرف ۱۰ر

لسان الغیب۔ حافظ شیرازی کی سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول ۳ر جلد دوم عاہ
شہاب کی سرگزشت۔ قیمت عہ
یادگار غالب۔ مرتبہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی ۳ر
کلیات نظم حالی۔ شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام قیمت عہ
نقش ارژنگ۔ جلال الدین صاحب اکبر کی غزلوں کا مجموعہ عہ
ابو مسلم خراسانی۔ جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا ترجمہ عاہ
الفاروق۔ مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیائے اسلام علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب ہے قیمت عہ

علامہ جرجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر کے چار نہایت مشہور عربی ناولوں کے ترجمے

حجاج بن یوسف عہ، عروس مصر عہ، عبد الرحمٰن ناصر عہ، امین بک ۱۲ر

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگایئے

کتب موصولہ

نیٹشے مترجمہ پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ایم اے۔ لکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی ضخامت ۱۰۲ صفحے مطبوعہ مطبع معارف قیمت عہ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

نیٹشے جرمنی کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جس کے خیالات نے جنگ عظیم کے بعد سے زیادہ شہرت پائی ہے۔ بحیثیت فلسفی ہونے کے اُسکا پایہ چنداں بلند نہیں اس کی شہرت کا راز انگریزوں کی برائی اور مسیحیت کی تردید میں مضمر ہے اُس کے فلسفیانہ مضامین کے روشن ادبی پہلو نے اس کی شہرت میں اور چار چاند لگا دیے۔

نیٹشے نے مسیحیت پر جہاں اور بہت سے اعتراض وارد کئے ہیں جنکی بنا پر اقبال کو "دستش از خون چلیپا احمر است" کہنا پڑا وہاں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگلے زمانہ کی تہذیب و تمدن سے ہمیں جو پھل ملنے والا تھا مسیحیت نے اسکو غارت کر دیا اور پھر بعد کو تمدن اسلام سے جو پھل ہمیں مل رہا تھا اسے بھی مسیحیت نے برباد کر دیا مسیحیت نے اندلس کے شاندار تمدن اسلام کا گلا گھونٹ دیا صلیبی جماعتیں مسلمانوں سے بار ہا لڑائیاں لڑیں لیکن اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اندر سما جاتے جنگ صلیبی اعلیٰ درجے کی رہزنی تھی" نیٹشے کی مسیحیت سے دشمنی بڑھتے بڑھتے مادیت کی آخری سرحد کو عبور کر گئی یہاں تک کہ خدا کو وہ ظالم کے سوا اور کچھ تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔

ایک طرف مسیحیت پر شاندار تمدن اسلامی کے برباد کرنے کا الزام دوسرے جانب نیٹشے کے ظالم خدا کو دیکھ کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "قلب او مومن دماغش کافر است" نیٹشے اشتراکیت کا دشمن ہے وہ انسان کی مساوات کو تسلیم نہیں کرتا اس کے خیالات اور نظریوں پر بحث کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ واقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے ایک اصول پر قائم نہیں رہتا آج ایک بات کہتا ہے تو کل دوسری وہ بھی ایک دوسرے کے منافی۔ ابتدائی زمانہ میں اسپر شوپنہار کا رنگ غالب تھا جسے کبھی کبھی وہ فوق البشر تک تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ لیکن آخر میں اسکی نظریے "ماورائے خیر و شر" اور فوق البشر عوم نے ایک اجتہادی شان پیدا کر دی ہے۔

افسوس ہے کہ اصل کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لئے ترجمہ کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم نہیں کیجا سکتی۔ بظاہر زبان فلسفیانہ موضوع کو دیکھتے ہوئے کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتی۔ حضرت مترجم خود بھی ترجمہ کے شکوہ سنج ہیں، اور اسکی دقتوں سے واقف کتابت کی غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں مثلاً منو کو قدیم ایران کا مشہور و معروف مقنن لکھا ہے بعض جرمن ناموں کا تلفظ بھی غلط ہے مثلاً ہین بجائے، ہائنا، گیٹے، بجائے گویٹے، نٹشے، بجائے نیٹشے، وغیرہ ذیل کے حواشی پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً مل، ڈارون۔ کارلایل وغیرہ پر جو نوٹ دے گئے ہیں وہ خالی از اغلاط نہیں جن الفاظ کے لئے اصطلاحیں مقرر ہو چکی ہیں

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

ان کی پابندی کی اشد ضرورت ہے مثلاً صفحے میں (Socialism) کا ترجمہ اشتراکیت کیا گیا ہے حالانکہ اشتراکیت (Communism) کا ترجمہ ہے (Socialism) کے لئے صحیح اصطلاح اجتماعیت ہے (Anarchism) کا ترجمہ فساد و شورش کے بجائے فوضویت، زیادہ مناسب تھا۔ امید ہے کہ طبع ثانی میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جو لوگ نیٹشے کے خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو زبان میں بعض بالغ نظر حضرات نیٹشے پر خصوصیت کے ساتھ دار المصنفین کی کوئی کتاب ہی دیکھنا پسند نہیں فرماتے

دنیائے افسانہ جناب محمد عبد القادر سروری بی اے نے جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے فاضل ہیں، یہ کتاب لکھی ہے اور غالباً اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو زبان میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

چونکہ افسانہ نگاری کا رواج اب بہت وسیع ہوتا جارہا ہے اور اسی کے ساتھ اکثر و بیشتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو اس فن سے بالکل ناواقف ہیں، اس لئے جناب سروری کی محنت یقیناً قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اس تصنیف کو پیش کرکے کم از کم یہ خیال پیدا کرنے کی تو کوشش کی کہ فن افسانہ نگاری ایک مستقل فن ہے اور ہر وہ شخص جو آئینہ رکھنے کا مدعی ہو۔ دعوائے اسکندری نہیں کرسکتا

یہ کتاب ۲۰ ابواب پر منقسم ہے اور ان میں افسانوں کی اہمیت، فنون لطیفہ اور افسانہ، افسانوں کی پیدائش، حقیقت اور افسانہ افسانوں کی قسمیں افسانہ کا ارتقا، ناول کی پیدایش ناول کا موضوع ناول کے عناصر، ناول کے منازل، اعلیٰ ناول کے خصوصیات ناول نگار کے فرائض، مختصر قصے، مختصر قصوں کا فن، اردو زبان اور افسانے، ابتدائی دور کے افسانے، فورٹ ولیم کالج کی کوشش اُردو ناول، اردو مختصر افسانے، اردو افسانوں کے مستقبل سے بحث کی گئی ہے۔

اس فہرست سے صرف یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ فاضل مصنف نے بحث کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں ہے۔ لیکن اگر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ انھوں نے کسی بحث کو تشنہ نہیں رہنے دیا اور جہاں تک تنقید و تحیص کا تعلق ہے وہ اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ نہ ہر افسانہ نگار و ناول نویس کے لئے ضروری ہے، بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو افسانے اور ناول پسند کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ افسانہ نگاری کا اصل معیار کیا ہے۔ اور اسی لحاظ سے وہ حسن و قبح کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔

یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے عہ میں مل سکتی ہے۔

تاریخ فلسفۂ اسلام ہالینڈ کے مشہور مستشرق دو بوئر نے انیسویں صدی میں فلسفۂ اسلام پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی نے اردو میں اس نام سے

روغن چنبیلی صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

پیش کیا ہے۔

چونکہ دو بوئر کی یہ کتاب غیر زبان کی کتابوں میں اس موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کا ترجمہ ہو جانا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بہتر ہوتا اگر فاضل مترجم اسی کے ساتھ ایک مقدمہ کا بھی اضافہ فرما دیتے تاکہ اصل کتاب پر تنقید بھی ہو جاتی اور وہ اسقام جو فارابی، ابن سینا ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن رشد وغیرہ کے متعلق اظہار رائے میں کہیں کہیں پیدا ہو گئے ہیں، دور ہو جاتے

بہرحال بحالت موجودہ بھی کتاب بہت مفید اور پُر از معلومات ہے۔ طباعت کتابت نہایت پاکیزہ ہے اور دو روپیہ میں مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

بیداری ہند جلد اول

جس طرح دنیا مہاتما گاندھی کی ہستی سے روشناس ہے اسی طرح ان کے مشہور اخبار ینگ انڈیا سے بھی واقف ہے سنہ ۱۹۱۹ء سے لیکر اس وقت تک مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا کے ذریعہ جس جس انداز سے اپنے پیغام کو ملک تک پہونچایا اور جن جن نازک موقعوں پر رہبری کی، وہ بھی کم از کم انگریزی طبقہ سے مخفی نہیں ہے،

ضرورت تھی کہ مہاتما گاندھی کے ان خیالات کی نشر و اشاعت اردو داں جماعت کے لئے بھی ہوتی اور اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے جناب متصدی لال صاحب کا جنھوں نے میرٹھ میں ایک مخصوص دار الاشاعت قائم کرکے اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر لیا اور پہلی جلد شائع کر دی۔۔ اس جلد میں تمام ان مضامین کا ترجمہ ہے جو سنہ ۱۹ء سے لیکر سنہ ۲۰ء تک مہاتما گاندھی کے قلم سے نکلے اور باقی مضامین سنہ ۲۱ء سے سنہ ۲۵ء تک کے دوسری جلد میں ہوں گے

حصۂ زیر تنقید میں کیا کیا مباحث ہیں اس کی تفصیل تو دشوار ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس دو سال کے اندر کوئی اہم مسئلہ ملک و بیرون ملک کا ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپ اس میں رہبری نہ پائیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور طباعت کتابت بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ ۔۔۸ صفحہ کی گنجان کتابت ہے اور ۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع ہے اس لئے قیمت دو روپیہ کسی طرح زاید نہیں ہو سکتی۔

میری رائے میں ہر وہ شخص جس کو کچھ بھی دلچسپی سیاسیات سے ہے اس کا فرض ہے کہ اس کو اپنے مطالعہ میں رکھے۔ یہ کتاب دار الاشاعت بیداری ہند میرٹھ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

عروس ادب

حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو حال ہی میں اس نام سے شائع ہوا ہے ہرچند نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صرف اُن کے ادبی مضامین ہوں گے لیکن دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات تاریخ، اور اخلاقیات کا عنصر غالب ہے اور چونکہ ان خشک مباحث میں بھی حضرت ہوش کے رنگینی قلم بدستور قائم ہے اس لئے اس مجموعہ کو عروس ادب کہنا نادرست نہیں ہو سکتا

حضرت ہوش کے نام سے علمی و ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے کیونکہ جس زمانہ میں آپ حیدر آباد سے ذخیرہ نکالتے تھے آپ نے

عطر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

ادیبوں کی صف میں اور آپ کے رسالہ نے اچھے رسالوں کی فہرست میں نمایاں جگہ حاصل کر لی تھی۔ چونکہ اس کے بعد بھی آپ رسائل و جراید میں برابر مضامین لکھتے رہے اس لئے آپ کا ادبی رشتہ ملک سے قائم رہا اور ہے۔

خالص ادبیات کے تحت میں جو مضامین آپکے قلم سے نکلے ہیں وہ بالکل تنقیدی ہیں اور اسی سے آپ کی ادبی ذوق کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخی حصہ میں ابونصر، مدہاتاک بلگرامی، شہریار دکن، اخلاقیات میں مقصد حیات، اور موت خصوصیت کیساتھ قابل داد ہیں۔

حضرت ہوش کا انداز تحریر بالکل انھیں کا ہے تقلیدی نہیں ہے۔ جو ان کے ذہن میں آتا ہے اُسے بغیر کسی تصنع کے ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے بیساختہ پن بہت ہے۔ ہوش فطرتاً بہت شوخ واقع ہوئے ہیں جن کا علم مجھے تو خیر ذاتی شناسائی و تعارف کیوجہ سے ہے۔ لیکن ایک شخص جس نے انھیں دیکھا وہ بھی اس مجموعہ کو پڑھکر یہی سمجھے گا کہ ان کی طبیعت بچلی رہنے والی نہیں ہے۔

یہ مجموعہ بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ چکنے کاغذ پر شائع ہوا ہے اور علاوہ محصول دو روپیہ میں دفتر نگار سے مل سکتا ہے

پریم درپن ہز اکسلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم حیدر آباد کی ایک مختصر سی مثنوی ہے جسمیں عہد جہانگیری کے ایک ایک تاریخی واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ جہانگیر ایک روز شکار کے لئے جنگل میں دور نکل گیا اور اسے پیاس کی تکلیف محسوس ہونے لگی اس کو ایک مندر نظر آیا۔ یہ وہاں پہونچا تو اسے ایک ہندو لڑکی نظر آئی جس کا نام روپ سنگار تھا۔ اس نے لڑکی سے پانی طلب کیا، اس نے پانی کے ساتھ جو کھانا حاضر تھا وہ بھی پیش کیا۔ اتفاق سے لڑکی اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر متحیر سی ہوئی۔ کیونکہ اس کا باپ زائچہ بناکر ایک پیشین گوئی کر گیا تھا کہ ایک مرتبہ دہلی کا بادشاہ تیرا مہمان ہوگا اُسکے ہات میں یاقوت کی انگوٹھی ہوگی اور وہی ذریعہ کامیابی ہوگا۔ آخر کار جہانگیر کو بھی اس پیشین گوئی کا حال معلوم ہوگیا۔ بڑی دہوم سے اس کی شادی ایک معزز برہمن سے کر کے سوا لاکھ کی جاگیر اس کے جہیز میں ہمیشہ کے لئے دیدی۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کو بقدر خوبصورتی اور اثر کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ اُن کی شاعرانہ قوت اور مشق سخن کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس نظم کی ابتدا ساقی نامہ سے کی گئی ہے اس کے بعد مہاراجہ بہادر نے اپنے کیش و ملت کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ :-

میں ہوں موحد میں ہوں صوفی	عارف یکجو و مجنوں صوفی
دیکھتا ہوں وحدت میں کثرت	کثرت میں پاتا ہوں وحدت
میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں	ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے	آزادی آزاد ہی جانے

اس کے بعد آپ نے موجودہ مسلم ہندو کشمکش کا نہایت عبرتناک الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ :-

ہندو مسلم ایک تھے پہلے	بیر نہ تھا کچھ نیک تھے پہلے

بغض و حسد سے پاک تھا سینہ
دل سب کا تھا صاف آئینہ

....

عہد اکبر بھول گیا کیا
دور گزشتہ آہ ہوا کیا

....

بڑھکے عزیزوں سے تھے ہندو
طاقتِ دل تھے قوتِ بازو

دلسوزی تھی ہمدردی تھی
ایک کو اک کی ہمدردی تھی

جہانگیر جب مندر پر پہونچا تو وہاں کا حال ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سامنے اس کے چشمہ ہے جاری
اور تر و تازہ پھولوں کی کیاری

دیکھا وہاں اک حور لقا کو
حسن کی دیوی ہوشربا کو

ماتھے پر چندن کا ٹیکا
جس سے قمر کا رنگ ہو پھیکا

میلی سی بوسیدہ ساری
اسپہ بھی صورت پیاری پیاری

جہانگیر اُس کو دیکھکر بولا مہ

میں ہوں مسافر رہ گم کردہ
بھول کے رستہ یاں آنکلا ہُو

تشنہ جگر کی آگ بجھادے
بیٹی تھوڑا پانی پلادے

جب یہ کھانے پینے سے فارغ ہوا تو اُس لڑکی کی ماں باہر آئی اور بیٹی سے پوچھا۔

....
یہ نو وارد کون ہے روپا

شاہنشاہ نے دیکھ کے چہرا
سر بہر تسلیم جھکایا

بولا میں ہوں ایک سپاہی
دور فتادہ لشکر شاہی

دہلی کا ہوں رہنے والا
رنج و مصیبت سہنے والا

رستہ بھولا ادھر آنکلا ہُو
پائی راحت دل ہوا ٹھنڈا

شکر گزار اس لڑکی کا ہوں
دل سے ہوں میں اس کا ممنوں

کھانا کھلایا پانی پلایا ہُو
ایک مسافر کا غم کھایا

ہنسنے لگی یہ سنکر روپا
سر کو جھکایا ہات کو جوڑا

بولی میں پہچان گئی ہوں سچ کہتے ہو کیونکر مانوں
تم ہو شاہنشاہ ہمارے اَن داتا ہو واہ ہمارے

اس کے بعد جہانگیر کو زائچہ اور پیشین گوئی کا سارا حال روپا نے بتایا اور بولی کہ:۔

آپ کا کہنا میں ہوں سپاہی دور افتادہ لشکر شاہی
کون اسے تسلیم کرے گا آپ ہمارے ہیں ان داتا

اس کو سنکر شاہنشاہ ہنسا اور بولا کوئی بھی ہوں میں اس سے غرض کیا

آج سے تم اماں ہو میری روپا میری بیٹی حقیقی ہو

جہانگیر پھر اس لڑکی کو نور جہاں کے پاس لے گیا اور وہاں چند دن کے بعد ٹالی کوٹا میں اس کی شادی ایک معزز برہمن سے ہوئی اسوقت کی تحریر جہاراجہ شاد کے پر زور قلم نے اس طرح کھینچی ہے:۔

تھا پر لطف عجب وہ منظر شاہنشاہ جب آیا اندر
شاہجہاں بھی ساتھ تھا اس کے کل درباری اس کے پیچھے
تخت شہی کے جملہ اراکین تھے یہ براتی باصد تمکین
بھنوری دیکھی رسمیں برتیں مذہبی اور ملکی جتنی تھیں
نکلا جہیز اندر سے باہر صحن محل کا بھر گیا یکسر
ٹالی کوٹا کی بھی ریاست شاہ نے کی روپا کو عنایت
سولہ لاکھ کا حاصل جس کا نام یہ تھا روپا کے لکھا
پھر اس میں لاکھوں کا اضافہ شاہجہاں نے بھی فرمایا
عالمگیر نے بھی شاہانہ دی جاگیر اسے سالانہ
بیش بہا وہ شہ نے انگوٹھی اول دن جو روپا کو دی تھی
ہے محفوظ خزانہ میں ابتک رکھی ہے توشکخانہ میں ابتک

اس مثنوی کو ختم کرنے کے بعد نتیجہ جن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے:۔

اب کچھ قوم کی حالت دیکھو دیکھا علم، جہالت دیکھو
آئے دن کی جنگ وجدل ہے آپس ہی میں ردوبدل ہے

خالص عطر ہر قسم کے صرف علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

گائے کی قربانی پہ جھگڑا   آگ پہ جھگڑا پانی پہ جھگڑا
مسجد کی دیوار پہ جھگڑا   باجوں کی جھنکار پر جھگڑا
اسیر ہیں سوراج کے طالب   تخت کے طالب تاج کے طالب

ساری مثنوی اس قدر سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے کہ اس سے زیادہ سلاست کا امکان نہیں۔ دیگر محاسن شاعری کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ مہاراجہ شاد نہایت کہنہ مشق اور استادانہ رنگ کے کہنے والے ہیں جس سے ملک کا ہر فرد واقف ہے میرے نزدیک اس مثنوی کا مطالعہ ہر شخص پر فرض ہے اور ضرورت ہے کہ اُسے مدارس میں داخل نصاب کر دیا جائے تاکہ جو درس محبت و اتفاق اس میں دیا گیا ہے وہ اسکول کی چار دیواری کے اندر ہی بچوں کے دل و دماغ تک پہونچ جائے۔ قیمت ۴ر رکھی گئی ہے اور سید صادق حسین صاحب غبار پیشکار مہاراجہ بہادر کے پتہ سے ملسکتی ہے۔

شرح شادمانی بر قصائد خاقانی

جناب شادمان لکھنوی نے جو رامپور کے اورنٹیل اسکول میں فارسی کے استاد اعلیٰ ہیں خاقانی کے اُن تیرہ قصیدوں کی شرح (جو الہ آباد، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ کے فارسی امتحانات میں داخل نصاب ہیں) اس نام سے شائع کی ہے جو ۳۰۰ صفحات کو محیط ہے۔

جناب شادمان نے پہلے مختصراً اپنی اُن تمام مساعی کا اظہار کیا ہے جو شرح کرنے میں اُن کو برداشت کرنی پڑیں اور پھر خاقانی کے مختصر حالات لکھ کر شرح کا آغاز کیا ہے۔ اس کی شرح و تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے اپنے بعض معاصرین پر کہیں کہیں حملے بھی کئے ہیں جس کی ضرورت نہ تھی نفس شرح کے متعلق تو اس وقت کوئی صحیح رائے دے سکتا تھا جب بالاستیعاب اس کا مطالعہ کرتا، لیکن جا بجا سرسری نگاہ ڈالنے سے میں اس نتیجہ پر ضرور پہونچا ہوں کہ جناب شادماں نے کافی محنت و مطالعہ کے بعد اس شرح کو مرتب کیا ہے اور یہ طالب علموں کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرنے والی ہے۔ بعض ان الفاظ کی تشریح میں جنکا تعلق روایات مذہب یا تاریخ مذہب سے ہے مجھے اختلاف ہے اس طرح کہیں کہیں تحقیق الفاظ میں بھی تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اختلاف کے یہ معنی نہیں کہ میں جناب شادمان کے اس قابل قدر سعی و کاوش کا اعتراف نہ کروں۔ انھوں نے یقیناً اس کتاب سے بہت مفید اضافہ اردو لٹریچر میں کیا ہے کیونکہ خاقانی کا کلام سمجھنا ہی بہت دشوار ہے چہ جائیکہ دوسروں کو سمجھانا۔ کتابت، طباعت، کاغذ نہایت نفیس ہے اور جناب شادمان سے رامپور اورنٹیل اسکول کے پتہ سے ملسکتی ہے قیمت درج نہیں ہے۔

طفل اشک

یہ ترجمہ ہے کسی انگریزی ناول کا جسے مولوی محمد حسن صاحب صدیقی بی اے (علیگ) نے صاف و شستہ زبان میں کیا ہے مجھے اس کے پڑھنے کی فرصت تو نہیں ملی لیکن جا بجا ورق گردانی کرنے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے کافی محنت سے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ فسانہ مغرب کے کسی متوسط الحال شریف گھرانہ سے متعلق ہے اور غالباً عامیانہ ذوق سے بلند ہے طباعت کتابت نہایت اچھی ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ مطبع رہبر دکن افضلگنج حیدرآباد ہے اور قیمت ۲ر ہے

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر حنا دنیا سے مشہور ہے

در ثمین

مجموعہ ہے اُن مختلف ۲۳ نظموں کا جنھیں مختلف حضرات نے مسز سروجنی نائیڈو کے انگریزی منظومات سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مسز سروجنی کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ ترجمہ بعض نظموں کا اچھا کیا گیا ہے اور بعض میں صرف خیال کو ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اردو نظموں کے ساتھ انگریزی نظم بھی دیدی گئی ہے اس لئے یہ مجموعہ ان لوگوں کے بھی کارآمد ہے جو صرف انگریزی میں ان نظموں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ اور بلا مجلد عہ رکھی گئی ہے جو زائد ہے۔ احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

سیر گل

مجموعہ ہے جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ) کے مختصر افسانوں کا جن میں سے بعض روسی معجز نگار چیخوف کے افسانوں کا ترجمہ ہیں اور بعض خود ان کی طبعزاد ہیں۔ چیخوف کے کمال فسانہ نگاری کے متعلق لکھنا بیکار ہے کیونکہ وہ روس کے نہایت ہی مقبول ادیبوں میں تھا، جناب جلیل نے ترجمہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ اس کے افسانوں کی روح کو قائم رکھا ہے۔

خود اُن کے طبعزاد افسانے بھی خوب ہیں اور تجزیۂ سیرت، جزئیات نگاری، اثر آفرینی، سلاست زبان اور بلندی تخیل کے لحاظ سے قابل داد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب جلیل قدرت کی طرف سے بہت رومان پسند دماغ لیکر آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے بجائے بیدار کرنے کے انسان کو سوجانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ طباعت کتابت نہایت پسندیدہ ہے عہ میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ سے ملسکتا ہے۔

مرقع ادب

جناب صفدر مرزاپوری نے نہایت محنت و کاوش سے ملک کے اکثر شعراء و مشاہیر ادب کے خطوط اس نام سے جمع کئے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ بعض حضرات کے خطوط نہایت دلچسپ دیا مزہ ہیں شروع میں چند خطوط غالب کے بھی ہیں جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ نہایت دلچسپ ہے اور تنہائی کے لئے بہترین ذریعۂ تفریح۔ جناب ریاض خیرآبادی کے خطوط میرے نزدیک اس مجموعہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔ منیجر نگار اور صدیق بکڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

حصۂ نظم

کارزارِ زندگی

اے شہیدِ دلفریبہائے کالائے حیات — وہ قتیلِ جلوہ پاشی شہابِ زندگی ہو

زندگی نومیدی و امید کی ہے کشمکش — شعلہ درآغوش رہتا ہے سحابِ زندگی

درد ناکامی و حسرت سے رہیگا تلخ ہی — کیف سے لبریز مینائے شرابِ زندگی

قلزمِ ہستی میں فطرت کی کشاکش ہے ضرور — جس سے اُٹھتا اور مٹتا ہے حبابِ زندگی

عیش و ناکامی کے ہنگامے ہیں ہنگامی سبھی — فطرتِ انسان ہے تفسیرِ کتابِ زندگی

ہے کبھی زینت دہِ تاج و کلاہِ خسروان — خاک میں غلطاں کبھی درِ خوشابِ زندگی

ابرِ آذاری کی آمد سے کبھی سرسبز ہے — ہے خزاں خوردہ کبھی شاخِ گلابِ زندگی

ہستیِ انسان چو مدوجزرِ گہوارہ ایست ؎

زان متاعِ عیش درگردابِ ہموارہ ایست

غلام ربانی عزیز

مجنونِ عامری کی تصویر کو دیکھکر

یہ دشتِ سوادِ غم — یہ کاہشِ وفا شیم

یہ سوزشِ درون ستم! — یہ حالِ زارِ پُر الم

ہے عشق سب ترا کرم — کہ ایک پیکرِ نعَم

عرب کا صاحبِ خدم — رئیسِ دولت و حشم

لیں جس کے حرمتہ قدم — جہاں نہ مارے کوئی دم

مگر ترے طفیل سے

وہ زار ہے، نزار ہے

یہ خارزارِ بے سکوں — یہ دشتِ نجد او جنوں

یہ حال جذبۂ درون — ہوا ہے، حد سوا فزوں

تپاں ہے، قلب نیلگوں — رواں ہے چشم ترسے خوں

نہیں ہے کوئی رہنموں — سکھائے جو کوئی فسوں

کہاں ہے بختِ تیرہ گوں — کہے جو آکر اس سے یوں

کہ اے مریضِ جستجو!

یہ ایک خارزار ہے،

اسیرِ عشقِ جانستاں — رہینِ لذتِ فغاں

نثارِ محمل رواں، — عرب کا ایک نوجواں

ہوا ہے ایسا نیم جاں — کہ استخواں ہیں سب عیاں

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

اسے یہی ہے، کچھ گماں کہ آرہی ہے "جانِ جاں"
ہے دشت میں رواں دواں وہ "روحِ دل" مگر کہاں
خیال ہی خیال میں
یہ وقفِ انتظار ہے

ہو داغِ قلب، خندہ زن مثالِ لالۂ چمن
ہے چاک چاک، پیرہن ہے سارا مضمحل بدن
خیالِ یارِ دل شکن ہو دل میں ایک جنوں فگن
برات ہے نہ، ہے دلہن! نہ بزم ہے، نہ انجمن
نہ ناقہ ہے نہ سیم تن نقط ہے، ایک حسنِ ظن
خیال کی فضا میں بس
غبار ہی، غبار ہے

نگاہ کر کے چار سو بہا کر آنکھ سے لہو
ہے پھر وہ وقفِ ہائے ہو کہ بر نہ آئی آرزو
فدائے حسن و عشق خو نثارِ لطفِ جستجو
جسے نہ پاسِ آبرو، مگر کہاں؟ وہ "ماہ رو"
جو آکے چشمِ فتنہ جو دکھائے "اس غریب" کو
تنہ سے اک کھجور کے
گھڑا ہو "جان نثار" ہے

قدیر ایولوی

سازِ زندگی

جام میں بھرے ہے مے، مے میں کیف، کیف میں رازِ زندگی
کیف ہے زندگی کا سوز، سوز ہے سازِ زندگی
زخمۂ یاس سے مرا سازِ امید توڑ کر
مطربِ روزگار نے کھو دیا سازِ زندگی
موت ہے کیسی عشوہ زا! کیسی الم نصیب زیست!
طالبِ موت ہو وہی جس پہ ہے نازِ زندگی
ہو گئی جان کا عذاب کشمکشِ حیات و موت
جلتی ہے موت دیکھ کر ہوں میں وہ نازِ زندگی
ہیں یہ شہاب طالعِ بد کی ستم ظریفیاں
تم کو دکھائے یوں امید اوج و فرازِ زندگی

شہاب برنی

شہاب کی سرگزشت عہ، نگارستان عہ، صحابیات عہ، تاریخ الدولتین عہ
منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

خالص عرق صبغ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عرق منگائیے

غزلیات

جناب اکبر حیدری

جہانِ حسن میں محوِ ترنم ہے وفا میری — میں نغمہ ہوں محبت کا، محبت ہے صدا میری
دلِ مضطر کو جبرِ اعتبارِ کامرانی تھا — مرے احساسِ خودداری میں ہے وہ التجا میری
امینِ دورِ مستقبل ہیں میرے خاک کے ذرے — حقیقت میں بقا کا پیش خیمہ ہے فنا میری
مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی — ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری
جہانِ قدس تک روحِ تخیل سیر کر آئی — مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا میری
اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ — نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے رُسوا التجا میری

حضرت راز رامپوری

پھر بسانا ہے کسی عالم کو — دیکھو دیکھو نہ مٹاؤ ہمکو
سجدے کرنے کو ملک کافی تھے — کیوں بنایا ہے تبھی آدم کو
سادگی ہائے محبت یعنی — ان سے امیدِ وفا ہے ہم کو
منزلیں ہجر کی طے کرنا ہیں — رات اندھیری ہے ستارو چمکو
شادمانی کی تمنا نکریں — غم ملے جائے جو پیہم ہمکو
لاؤ غم سارا مجھی کو دیدو — دیکھتے کیا ہو بھرے عالم کو
زندہ رہنا نہ سکھاؤ لیکن — جان دینا تو بتا دو ہمکو

راز دنیا سے الگ بیٹھے ہیں
لوگ کیوں چھیڑ رہے ہیں ہمکو

ہر قسم کا عطر صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئیں۔

حضرت حافظ غازیپوری

اسرار ابتدا کی کوئی انتہا نہیں
میں نقطۂ ازل تو ہوں لیکن خدا نہیں

ہستی کا حرف حرف سکونِ آشنا نہیں
وہ کون ہے جو گرمِ رہِ مدعا نہیں

دیکھا نہیں ہے تجکو کہ اب دیکھتا نہیں
یہ بات دوسری ہے جو خود آشنا نہیں

ہٹ کر حدودِ منظرِ فانی سے دیکھئے
اک مبدءِ نشاط ہے کچھ ماسوا نہیں

عشقِ ادب سرشت ہے محوِ سجودِ شوق
اللہ رے نازِ حسن اُسے اعتنا نہیں

میں ہوں مٹا مٹا سا نشانِ غمِ ہوش کا
دیوانگیِ عشق میں مجکو فنا نہیں

وہ داغ دل جو برقِ تجلی نہ بن سکے
کچھ ہو مری نظر میں مگر رہ نما نہیں

سن سن کے جسکو روح میں پیدا ہو اک اثر
کیا نے نوازیوں میں تری وہ صدا نہیں

تھرا رہا ہے نورِ تجلی فروغ میں
مثلِ کلیم کوئی پئے التجا نہیں

حافظ انھیں سنادے جنھیں ہے غرورِ حسن
تم وجہِ مدعا ہو مگر مدعا نہیں

یوسف گجراتی

دیدنی ہے تری جمال کا رنگ
حسن اور حسن بے مثال کا رنگ

چشمِ مخمور کے تصور سے
کیف زا ہو گیا خیال کا رنگ

حسن جلوہ فروز دل میں ہا
دیکھئے شوقِ لازوال کا رنگ

کھو گئے طور پر کلیم اللہ
اللہ اللہ تری جمال کا رنگ

موج میں آگیا ہے بحرِ کرم کو
دیکھکر میرے انفعال کا رنگ

آپ کے فائدہ کی بات

یہ امر بالکل مسلم ہے۔ کہ آپ اپنے ذوقِ علمی کی بنا پر، کہیں نہ کہیں سے کتابیں ضرور خریدتے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ کو یہ گراں ملتی ہوں اور بعض مرتبہ ارزاں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قیمت اور رعایت کے ساتھ ہمارا یہ چھوٹا سا بک ڈپو ہر قسم اور ہر علم و فن کی کتابیں" عام اس سے کہ وہ لکھنو کی چھپی ہوئی ہوں یا باہر کی" آپ کو مہیا کردے گا وہ کہیں سے نہ مل سکیں گی۔ اور یہی سبب ہے جو نسبتاً دیگر تاجرانِ کتب و مطابع آنہ دو آنے فی روپیہ کی رعایت ایک معمولی سی بات ہے مفصل حالات و اسبابِ رعایت اور نادرۂ روزگار کتب کی فہرست، شائقین کے طلب فرمانے پر مفت ارسال خدمت کیجاتی ہے۔ والسلام

مشہور مصنفوں کی مشہور کتابیں

تہذیب النفوس	۱۲ر	سیرۃ النعمان	عہ ر	حاجی بغلول	۱۲ر
الاخلاق	۱۴ر	الفاروق	عہ	احمق الذین	۱۲ر
نافع الخلائق	عہ ر	گلزار سرور	۸ر	مذاہب الاسلام	۱۸ر
اسلام و دیگر مذاہب	۸ر	حسن کا ڈاکو کامل	عہ ر	انگلش ٹیچر و-ھ	۱۰ر
تحفۃ الہند	۸ر	دربار حرام پور کامل	۹ر	ہماری مشکلات	۱۰ر
اردوئے معلے (غالب)	عہ	عجائب المخلوقات باتصویر	۱۸ر	عقل و شعور	۱۵ر
مثنوی در شہوار	۸ر	تصویر در	۳ر	مجمع الفنون	۱ر
گلدستۂ یوسفی	۸ر	فریاد امت	۲ر	تواریخ سلاطین اودھ	عہ
فضائے چمنستاں	۳ر	شمع و شاعر	۱ر	سدرشن حصۂ اول	۹ر
تاریخ ابلیس	۳ر	محل خانۂ شاہی	۵ر	" " دوم	۹ر

ملتمس
خیر طلب (ایچ۔ ایم) عزیز الدین احمد قریشی جنرل منیجر و پروپرائٹر "مفید عام بک ڈپو"، لکھنؤ